جب سے شباب آیا

مصنفہ

عادل رشید

قیمت چار روپے آٹھ آنے

ناشر

چوہدری مقبول احمد پرنٹر و پبلشر نے امرت پریس میکلوڈ روڈ لاہور
سے چھپوا کر شائع کیا

ایک رومانی ناول

ونگیٹن کلب کا خوبصورت ہال ردم دلہن کی طرح سجا ہُوا تھا۔ اور حسین و جمیل جوڑے قیمتی لباسوں میں ملبوس اور چمکدار اور خوبصورت فرش پہ ایک دوسرے کے سہارے اِدھر اُدھر سے پھسلتے پھر رہے تھے۔ ہاتھوں میں ہاتھ دیئے اور سینہ سے سینہ ملائے انگریزی خوشبوؤں کی ملی جُلی خوشبو فضاؤں میں تعطر پیدا کر رہی تھی، اور ایک کیف پرور فضا پورے ماحول کو اپنا گرویدہ بنائے ہوئے تھی۔

اپرا کی میٹھی اور سریلی نغمہ کے ساتھ فرش پر پھسلتے ہوئے پیروں کی ہم آہنگی ایک نیا حسن پیدا کر رہی تھی۔ اور قیمتی لباسوں کی پیہم سرسراہٹوں اور ہلکے ہلکے۔ دبے دبے قہقہوں کی پھواریں۔ غم روزگار اور غم دنیا جیسی باتوں پر پھبتی کا کام کر رہی تھیں ـــ

کارک اُڑ رہے تھے۔ اور جام خالی ہو رہے تھے۔ خام خالی ہو رہے تھے۔

اور کارک اڑ رہے تھے۔ بیروں اور ویٹروں کی مصروفیات پر بخششوں کا رنگ غالب تھا۔ اور ان کی دودھ جیسی سفید وردیوں پہ آسودگیوں کی لہریں ثبت تھیں۔ اخلاص و بیچارگی کی ایک معمولی سی شکن بھی ان کی صاف شفاف وردیوں پہ کہیں دور دور نظر نہیں آرہی تھیں۔

بلیک اینڈ وائٹ کے جاموں میں زمردی آویزاں کا عکس تھا۔ اور کاک ٹیل کے جھگوں سے نیم عریاں حسن چھلا پڑ رہا تھا۔

پھیل رہا تھا۔ اور پھیل پھیل کر گلاسوں میں سمایا جا رہا تھا۔ لب و رخسار کی لالیاں سنہری جاموں میں مدغم ہوئی جا رہی تھیں۔

اوپر کی مدھر دھنیں ایک ہلکی سی چیخ کے ساتھ سازوں میں سو گئیں اور پھر تھوڑی دیر کے لئے تالیوں کی گونج سے فضا معمور ہو گئی۔ رقص کرتے ہوئے پیروں کی گردشیں تھم گئیں۔ اور لباسوں کی سرسراہٹوں کے ساتھ سنگ مرمر کے فرش پہ رکھی ہوئی کرسیاں۔ تھوڑا سا سرائیں۔ اور پھر کامل سکوت طاری ہو گیا۔

کارک اڑنے لگے۔ اور پھر قلقل کی صداؤں کے ساتھ جام یکے بعد دیگرے آپس میں ٹکرانے لگے۔ بخشش کے غلاموں کی مصروفیات دوچند ہو گئیں۔

بال روم کی معطر فضا میں رونہ کا جانا پہچانا ساز لرز اٹھا جسے سننے والے اپنی سدھ بدھ کھو کر ہمہ تن گوش ہو گئے۔ تو ہر ایک کی توجہ مرکز وہ خوبصورت مغنی

تھا۔ جو پیانو پہ بیٹھا ہُوا پیانو کے سروں کو بکھیر رہا تھا۔
پورا ماحول ہمہ تن گوش تھا۔ کہ زندگی میں پہلی بار شوخ و شنگ شہلا دلکشا کلب کے اس ہال میں داخل ہوئی اور اس کے داخل ہوتے ہی مغنی نے نغمہ چھیڑا۔

نگاہوں میں شوخی۔ اداؤں میں مستی۔ وہ بجلی گراتے چلے آ رہے ہیں۔

اور اپنی سیٹ کی طرف بڑھتی ہوئی شہلا کے قدم خود بخود رک گئے۔ اس نے نفرت بھری نگاہوں سے گانے والے کو دیکھا مگر ان کی خفگیوں کی پرواہ کئے بغیر گانے والے نے بغیر کسی احساس ندامت کے اسے اپنی مسکراتی ہوئی آنکھوں سے دیکھا۔
اور وہ گاتا رہا۔

وہ انداز جنون۔ وہ اظہار خفگی کوئی اپنے دل کو بچائے تو کیسے!

شہلا کی پیشانی پر ندامت کا پسینہ پھوٹ پڑا اور وہ غصے سے اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔ وہ آگے بڑھی اور اسی جگہ رکھی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ گانے والے نے جھوم کر اس کی طرف کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے دوسرا مصرعہ دہرایا۔

غضب تو یہ دیکھو ستم تو یہ دیکھو۔ وہ رہ رہ وادس کر بھوؤں کو چڑھا کر
وہ اظہار خفگی کئے جا رہے ہیں۔ کہ جیسے ہوں معصوم دل کو چرا کر

اور اس بول پر تو شہلا جیسے سچ مچ رو سی دی۔ اسے اپنی حد سے زیادہ توہین کا احساس ہُوا۔ اور وہ سوچنے لگی کہ وہ کاش ایسی بیہودہ جگہ نہ آئی ہوتی ایسی جگہ جہاں جان بوجھ کر اس کا مذاق اڑایا جا رہا ہو۔ اور اس طرح کھلے بندوں وہ اس قسم کے بیہودہ اظہار عشق پر قطعاً تیار نہ تھی۔ لہٰذا وہ اور زیادہ جذباتی بن کر بل کھانے لگی۔ اور اس کی یہ حالت۔ دوسروں کے لئے مزید تفریح کا سامان ہو گئی

لوگ اس کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ اور وہ جز بز ہوتی جا رہی تھی۔ کہ شور مغنی نے حجوم لگایا۔ ادائیں قیامت۔ جفائیں قیامت۔ جوانی کی اٹھتی امنگوں کے آگے۔

ہزاروں شہیدان الفت کھڑے ہیں۔ ادب سے وہ سب اپنی نظریں جھکائے

اور اس بار تو گانے والے نے بد تمیزی کی حد کر دی۔ وہ اس کی طرف اشارے بھی کرنے لگا۔ اور شہلا جھلا کر غصے سے کھڑی ہو گئی۔

اور ابھی وہ اٹھی ہی تھی کہ گانے والے نے گویا اس پہ ایک اور چوٹ کی۔

یہ غصے کا عالم۔ دکھاوے کی باتیں۔ وہ محفل سے اُٹھ کر چلے جا رہے ہیں۔

کہ جیسے قیامت اُٹھا چاہتی ہو ــــــــ

وہ مارے غصے کے بوکھلا گئی۔ اس کے نتھنے پھول گئے۔ سانس تیز تیز چلنے لگی۔ بھوئیں تن گئیں اور چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس کے کان کے خوبصورت آویزے زور سے ہلنے لگے۔

مگر ان تمام باتوں سے بے نیاز گانے والا گاتا رہا ــــــ

وہ کانوں کے بالے کہو چاند جیسے کوئی چودھویں کا لرزتا ہے۔ دیکھو وہ غصے سے ان کے نہیں تاب اس کی یہ بھی آنکھیں ملائے۔ وہ اظہار خفگی کئے جا رہے ہیں۔

اور اب بات شہلا کی برداشت سے باہر ہو چکی تھی۔ وہ غصے سے اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔ اس نے زور زور سے اپنے داہنے پاؤں کو فرش پر پٹکا اور غصے میں بھری ہوئی بھوکی شیرنی کی طرح لپکی اور قبل اس کے کہ مغنی کی آواز کوئی اور نیا گوشہ چھوڑے۔ قریب پہنچکر اس نے اپنے داہنے ہاتھ سے ایک بھرپور طمانچہ گانے والے کے داہنے رخسار پہ دے مارا۔

گانے والے کی آواز یکبارگی گھٹ کر دفن ہو گئی۔ اور تمام لوگ یکبارگی اپنی اپنی جگہوں سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ پورے ہال پر سناٹا چھا گیا۔

"یو ایڈیٹ ۔ اسکل ۔۔۔" شہلا گرج رہی تھی۔

تمہاری اتنی مجال ۔۔۔ بیہودہ ۔ آخر تم نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے۔ لفنگا کہیں کا۔

مینیجر یکدم بھاگا بھاگا آیا۔ لوگ آکر اکٹھے ہو گئے۔ اور شہلا کھڑی غصے میں کانپ رہی تھی۔ مگر مینیجر نے ترش روئی سے کہا۔

"یہ کیا غضب کیا آپ نے ۔۔۔؟"

منی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے اور وہ اپنے داہنے ہاتھ سے اپنے گال پکڑے ہوئے تھا۔ کہ شہلا گرجی۔

"یہ تم مجھ سے پوچھتے ہو کہ میں نے کیا کیا؟" وہ غصے سے چلائی۔

"اس لوفر سے کیوں نہیں پوچھتے کہ یہ اس کی کیا حرکت تھی۔ کیا تمہارے کلب میں شریفوں کے ساتھ یہی سلوک کیا جاتا ہے؟"

اور وہ پھر بغیر کسی بات کی پرواہ کئے ہوئے منی پر برسی۔

"اور اب بھی یک ٹک دیکھ رہا ہے مجھے ۔ پاجی کہیں کا ۔۔۔"

اور وہ اس کے طمانچے مارنے جا رہی تھی۔ مگر مینیجر نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"بہت بڑا ظلم کیا آپ نے۔ معافی مانگئے آپ مسٹر جیون سے"

"معافی ۔۔۔" شہلا ہونٹ کاٹ رہی تھی "کس بات کی معافی ۔۔۔؟ کیا اس بات کی کہ میں نے اسے اس کی حرکت پر کہ وہ مجھے دیکھتے ہی اظہار عشق کرنے لگا تھا۔ سزا کیوں دی اسے ۔۔۔؟"

"کیسی باتیں کرتی ہیں آپ" منیجر بولا۔

مسٹر جیون آپ کو دیکھ سکتے ہیں۔ وہ اندھے ہیں بیچارے"

"ہیں ۔۔۔! کیا کہا ۔۔۔ ؟" شہلا کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"اندھے ہیں آپ"

"جی ۔۔۔!" منیجر تاسف کے ساتھ ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔ بہت بڑی غلطی کی آپ نے۔ بہت برا ہوا یہ ۔۔۔"

شہلا حیران و پریشان کھڑی جیون کو تک رہی تھی۔ کہ وہ اپنی جگہ پر سے اٹھا۔ اور وہ منہ دوسری طرف موڑ کر جانے لگا۔ وہ راستہ ٹٹول ٹٹول کر چل رہا تھا۔ لوگ ششدر اور افسردہ کھڑے تھے۔ کہ شہلا یکبارگی جیون کی طرف لپکی اور اس نے اس کا راستہ روک کر بڑی ندامت اور بڑے افسوس کے ساتھ کہا۔

"معاف کیجئے گا۔ مسٹر جیون مجھ سے بڑی غلطی ہو گئی۔ میں آپ سے معافی مانگتی ہوں۔ ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتی ہوں"

"کوئی بات نہیں شہلا۔ بڑے کرب کے ساتھ بولا ۔۔۔"

"قدرت کے اس قسم کے مذاق میرے لئے نئے یا انوکھے نہیں ہیں۔

اسکی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ بہہ کر اس کے رخساروں کو تر کر رہے تھے۔

شہلا بڑے گومگو کے عالم میں تھی۔ اس وقت بڑی نادم اور بڑی چور سی بنی ہوئی اس کا تالو خشک ہو گیا تھا۔ اور بار بار وہ اپنے ہونٹوں پر اپنی زبان پھیر رہی تھی۔ کہ وہ پھر بولی ۔۔۔

آپ کو ایشور کی سوگند مجھے شما کر دیجئے۔"

"آپ ناحق پریشان ہو رہی ہیں۔ جیون طنزیہ انداز میں تمسخرانہ مسکراہٹ اپنے افسردہ چہرے پر پھیلا کر بولا۔

"اس میں آپ کا نہیں میرے وقت کا قصور ہے۔"

"دیکھئے میں آپ کے پیر پکڑتی ہوں۔"

اور وہ بیچ بیچ جیون کا راستہ روک کر اس کے سامنے دو زانو ہو گئی۔

"مجھے شما کر دیجئے۔"

"مس شہلا نے غلط فہمی میں ایسی حرکت کی ہے۔ مسٹر جیون بینجر بولا۔ معاف کر دیجئے انہیں۔"

"معاف کر دیا۔"

"آپ نے بڑا احسان کیا میرے اوپر۔ بہت بڑا احسان۔" شہلا سنجیدگی سے بولی۔

"میرے سینے پر سے آپ نے بھاری بوجھ ہٹا دیا ہے۔ میں آپ کی ممنون ہوں کہ آپ نے میرے ضمیر کے رحم و کرم پہ مجھے نہیں چھوڑا۔

اس نے بڑی گرمجوشی سے جیون کے ہاتھوں کو اپنی مٹھیوں میں بھینچ لیا۔

"آپ انسان نہیں دیوتا ہیں۔"

"ہنہ۔" جیون بڑبڑایا۔ اور ایک سرد آہ اس کے سینے سے نکل گئی۔

"کاش میں انسان ہی رہتا۔"

اُسکے چہرہ پر دنیا جہاں کی مایوسیاں اور بیچارگیاں سمٹ آئی تھیں۔

قصبہ ہمیر پور رائے بہادر دینا ناتھ کی جاگیرداری تھی۔ ہمیر پور کے علاوہ ان کے اور کئی گاؤں تھے۔ اور ان کی یہ اتنی بڑی جاگیریں خاندان سے چلی آ رہی تھیں۔ وہ خاندانی رئیس تھے۔ وہی رکھ رکھاؤ۔ وہی جذبہ اور مرتبہ تھا اور وہی شان و شوکت تھی۔ رائے بہادر دینا ناتھ بڑی پرانی وضع قطع کے بزرگ تھے۔ مگر اس قسم کے بزرگ وہ ہرگز نہیں تھے۔ کہ اپنے زعم میں وہ وقت کا ساتھ نہ دے سکیں۔ بلکہ وہ وقت کے ساتھ ساتھ اس کے تقاضوں پر چلنا اور اسے پورا کرنا اچھی طرح جانتے تھے۔ اور یہی وجہ تھی کہ انہوں نے ہر طبقہ اور ہر سوسائٹی میں اپنے لئے ایک خاص مقام بنا لیا تھا۔ ہر محفل میں ان کی عزت ہوتی اور ہر سوسائٹی میں پوچھے جاتے تھے۔ وہ پرانی تہذیب و تمدن کے علمبردار ضرور تھے۔ مگر نئی تہذیب کو بھی انہیں بیر نہ تھا۔ وہ اس جدید تہذیب کو بھی اس وقت کے لحاظ سے خاص اہمیت دیتے تھے۔ ان کا کہنا تھا۔ کہ وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ پرانی قدریں بدلتی رہتی ہیں۔ اور انہیں یقینی طور پر بدلتے رہنا

چاہیئے بھی۔

۱۹۱۴ء کی بڑی لڑائی میں جب کہ وہ جوانی کی حدود میں قدم رکھ چکے تھے۔ انہوں نے سرکار برطانیہ کا بڑا ساتھ دیا تھا۔ گاؤں سے بہت سے رنگروٹ انہوں نے بھرتی کرکے بھیجے تھے۔ روپیہ سے بھی انہوں نے سرکار کی خوب دل کھول کر مدد کی تھی۔ اس وقت وہ زمانہ تھا۔ جب کہ ان کے والد ٹھاکر گوالہ لالہ کندلی ناتھ کا حال ہی میں انتقال ہوا تھا۔ اور اتنی بڑی جاگیر کی ذمہ داریاں انہیں تن تنہا سنبھالنی پڑ رہی تھیں۔ مگر وہ اس بات سے ہراساں نہیں ہوئے تھے کہ وہ تنہا ہیں۔ انہوں نے بڑی ہی سمجھداری اور دانائی سے جاگیر کا انتظام سنبھالا تھا۔

اور نہ صرف یہ کہ وہ باپ دادا کی اس خاندانی جاگیر کو ہی سنبھالیں۔ انہوں نے اپنی محنت اور کوشش سے اس جاگیر میں کئی گاؤں کا اضافہ بھی کیا تھا انہوں نے آس پاس پڑوس کے گاؤں تھوڑے ہی عرصے میں خرید لئے تھے۔ اور انہیں جاگیر میں شامل کر لیا تھا۔

پرانے اور خاندانی رائسوں کی طرح رائے بہادر دینا ناتھ بدعادتیں بھی نہیں تھیں۔ نہ تو انہیں طوائف بازی کا شوق تھا اور نہ طوائفیں ان کی ملازم تھی۔ نہ وہ رعایا کی بہو بیٹیوں کو تکا کرتے تھے۔ اور نہ انہیں اس قسم کے مشاغل سے کوئی دلچسپی تھی۔

البتہ وہ کھانے اور کھلانے کے از حد شائق تھے۔ ان کی ڈیوڑھی پر مہمانوں کی برابر جاری رہتی تھی۔ آج کوئی مہمان ہے تو کل کوئی چلا آرہا ہے

عزیز ۔ اقارب ۔ رشتہ دار اور اپنوں کے علاوہ دوست ۔ احباب ، اور یہاں تک وہ بھی رائے بہادر کے مہمان بنتے ۔ جن کا ان سے دور کا واسطہ نہ تھا ۔ غرضیکہ انکی ڈیوڑھی ہر خاص و عام کے لئے اپنی گود ہر وقت کھولے رہتی تھی ۔

اور اس مہمان نوازی میں کسی قسم کی مذہب و ملت کی تخصیص بھی کوئی نہ تھی ۔ ان کے یہاں آنے والوں میں ہندو بھی تھے ۔ اور مسلمان بھی سکھ بھی تھے ۔ اور دوسرے لوگ بھی ۔ ان کا برتاؤ ہر ایک کے ساتھ یکساں تھا ۔

شکار کا البتہ انہیں بے حد شوق تھا ۔ اور گھوڑے کی سواری پر وہ دل و جان سے فدا تھے ۔ اور یہی وجہ تھی ۔ کہ ان کے اصطبل میں بڑے بڑے قیمتی جانور بندھے رہتے تھے ۔ ہندوستانی نسل کے علاوہ عربی اور انگلش گھوڑے بھی ان کے اصطبل میں موجود تھے ۔ ایک سے ایک اعلیٰ اور بڑھ چڑھ کر ۔

اور اس شکار کے علاوہ رائے بہادر کو اور کسی بات کا شوق نہیں تھا ۔ کوئی ایسا شوق جو دیوانگی کی حد تک بڑھا ہوا ہو ۔

اور جیون انہیں رائے صاحب بہادر کا اکلوتا بیٹا تھا ۔ جو شادی کے پورے آٹھ سال بعد بڑی منتوں اور مرادوں کے بعد پیدا ہوا ۔

اولاد کی خوشی کے نہیں ہوتی۔ اور پھر ایسی اولاد جو بڑی منتوں
اور مرادوں کے بعد شادی کے پورے آٹھ سال پیدا ہوئی ہو۔ رائے
بہادر صاحب نے خوب جی کھول کر خوشیاں منائیں۔ دعوتیں ہوئیں۔ ناچ رنگ
کی محفلیں ہوئیں۔ غریبوں اور محتاجوں کو پورے آٹھ روز تک خیر خیرات دی
گئی۔ لنگر جاری رہے۔ اور دعوتوں کا سلسلہ پندرہ بیس دن تک یونہی
جاری تھا۔

بیٹے کی پیدائش کی خوشی میں رائے صاحب نے اپنی پوری جاگیرداری
میں ایک فصل کا پورا لگان یکدم معاف کر دیا۔ اور وہ کاشتکار جو چھوٹے
تھے اور غریب تھے۔ ان کا اگلی فصل کا بھی لگان نصف معاف کر دیا گیا
بہت سی سیر غریب کاشتکاروں میں مفت تقسیم کر دی گئی۔

اور جیون اپنے ماضی کے انہیں دھندلکوں میں کھویا ہوا تھا۔ کہ
یکبارگی اس کے خیالات کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اس کا ملازم اس
سے کہہ رہا تھا۔

"سرکار ۔۔۔! ایک مس صاحبہ آپ سے ملنے آئی ہیں۔"

"ایں ۔۔۔!" جیون چونک پڑا۔

"بھئی بڑے عجیب نوکر ہو تم ہمارے" وہ کوفت کے ساتھ بولا "کتنی بار تمہیں سمجھایا کہ ایڈیٹروں کے ملنے کا سندیسہ تم میرے پاس لیکر مت آیا کرو۔ مگر تم سمجھتے ہی نہیں ہو"

"مگر سرکار، مگر وہ مس صاحبہ مانتی ہی نہیں۔ جان کو آ گئی ہیں۔ میرے کہتی ہیں کہ میں اب صاحب کے ملے بغیر یہاں سے نہ جاؤں گی"

"تو تم نے کیا کہا"

"میں کیا کہتا سرکار۔ سیدھا آپ کے پاس چلا آ رہا ہوں"

"کہہ دیتے کہ ہمارے صاحب گھر پر نہیں"

"مگر سرکار ـــ" ملازم تھوک نگلتے ہوئے بولا۔

"وہ مس صاحبہ اتنی زیادہ اچھی ہیں کہ میں ان سے سوائے اچھا کے اور کچھ کہہ ہی نہیں سکا"

جیون یونہی مسکرا دیا۔

"تو ـــ!"

"تو آپ ان سے ضرور مل لیجئے سرکار"

ملازم فوراً بول پڑا۔

"بلا لاؤں اندر سرکار"

اور نہ جانے کیوں جیون اپنے ملازم کی اس سفارش پر مسکرا دیا۔ اور بولا۔

"بلا لاؤ ـــ"

اور ملازم یہ سوال سنکر بھاگا ہُوا گیا اور شہلا کو بلا لایا جو سڑک کے کنارے اپنی شاندار بیوک پر بیٹھی بڑی بے چینی سے ملازم کے جواب کا انتظار کر رہی تھی۔

"جی! آپ تشریف رکھیئے مس صاحبہ"

وہ شہلا کو ایک صوفہ پر بیٹھ جانے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"میں صاحب کو ابھی لے آتا ہوں"

ملازم چلا گیا۔ اور شہلا اسی جگہ کھڑے کھڑے کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ اس کی نگاہیں دیوار پہ لگی ہوئی خوبصورت تصویر سے گذرتی ہوئی دیوار کے نیچے آئیں۔ جہاں ایک کونے میں اسٹینڈ پر رکھے ہوئے خوبصورت گلدان میں گلاب کی تازہ کلیاں مسکرا رہی تھیں۔

اور پھر اس سے ذرا ہٹ کر شہلا کی نظریں ایک پیانو پر پڑیں۔ اور وہ جیسے اس پیانو کو دیکھ کر ڈر گئی ہو۔ وہ چونک سا پڑی۔ اور جیسے اس کے ذہن میں کانٹے سے چبھنے لگے۔

کہ اتنے میں کچھ ذرا سی آہٹ ہوئی۔ اور شہلا نے دیکھا کہ جیون تیے تلے قدموں کے ساتھ کمرہ میں داخل ہُوا۔

اور آتے ہی اس نے ایک جگہ کھڑے ہو کر اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے"

"نمستے"

اور پھر وہ جواب کا انتظار کئے بغیر بولا۔

"تشریف رکھیئے"

اور شہلا کچھ جواب نہ دیکر کھوئے انداز میں جس میں فکریں زیادہ ہوں
اپنی جگہ بے حس و حرکت کھڑی جیون کو بغور دیکھتی رہی۔ سر تا پا۔ سر سے پیر تک
اور جیون اندازہ لگاتے ہوئے صوفہ پر بیٹھ گیا۔
"فرمایئے! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں" وہ سامنے منہ اٹھائے
ہوئے پوچھ رہا تھا۔
شہلا کی محویت ختم ہو گئی۔ اور وہ جواب میں گھبرا کر اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے بولی۔
"نمستے —!
"جی۔؟" جیون نے متعجبانہ اپنی پلکیں جھپکائیں۔
"نمستے —" اس نے دوبارہ ہاتھ اٹھائے۔
چند لمحہ کمرے میں کافی سکوت رہا۔ صرف شہلا کے دل کی دھڑکنیں تھیں جنہیں
وہ خود گن رہی تھی۔ آخرش وہ اپنے ہونٹوں پر اپنی زبان پھیرتے ہوئے بولی۔
"آپ میری بیوقوفی اور ناسمجھی پر ابھی مجھ سے اب تک ناراض ہیں —؟"
"اوہ —!" جیون صوفے پر پہلو بدلتے ہوئے بولا۔ "تو آپ ہیں۔؟
جیون نے لفظ "آپ" پر زور دیتے ہوئے کہا۔ اور شہلا بڑی بیچارگی سے
اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے تھوک نگلنے کی کوشش میں بولی۔
"جی —! میں شہلا ہوں —"
کیا خدمت کر سکتا ہوں میں آپ کی —؟"
آپ مجھے معاف کر سکتے ہیں"
"یہ تو پرانی بات ہے" یونہی سا مسکرا دیا" وہ تو میں اسی دن معاف

کہہ چکا تھا۔ آپ کو —"

"یہی —

"جی —!"

"میں اپنی غلطی کی سزا چاہتی ہوں آپ سے"

"غلطی سزا کی مستحق نہیں ہوتی"

"میں نے غلط کہا" شہلا لجاجت سے بولی "غلطی نہیں کی تھی میں نے میں نے جرم کیا تھا"

"جرم —!" جیون لاپرواہی سے بولا۔ "وہ جرم نہیں ناسمجھی تھی۔ غلط فہمی تھی وہ آپ کی"

اور یہ کہکر فوراً ہی شہلا کو بات کرنے کا موقع نہ دیتے ہوئے جیون نے موضوع بدلنے کی خاطر پوچھا۔

"آپ چائے پیئیں گی —؟"

"جی نہیں۔ شکریہ" شہلا جیون کو بغور دیکھ رہی تھی۔ یکٹک۔ جیسے وہ اس کے دل میں اُتر جانا چاہتی ہو۔

"اچھا —" جیون نے پھر سوال کیا۔

"کچھ اور —"

"جی نہیں —"

اور پھر جیون کے انداز سے یہ ظاہر ہونے لگا۔ جیسے کہ وہ شہلا سے کہہ رہا "کہ اچھا پھر تشریف لے جایئے آپ۔" شہلا یکبارگی کچھ دیر خاموش رہ کر بولی

"اگر میں آپ کو اپنے غریب خانہ پر لے چلنے کی درخواست کروں"۔

"تو میں معافی مانگ لوں گا آپ سے"۔

"مگر ——"

جیون نے بات کاٹی۔

"دیکھیے۔ بات دراصل یہ ہے کہ میں تنہائی اور گمنامی کی زندگی کا عادی ہوں" رک رک کر بولا۔

"میرے دل کو خواہ مخواہ تکلیف ہوتی ہے۔ ان باتوں سے امید ہے کہ آپ مجھے معاف فرمائیں گی"۔

اور جیون کے اس سرد برتاؤ پر شہلا چپ سی ہو گئی۔ وہ بہت کچھ کہنا چاہ رہی تھی۔ مگر کچھ نہ کہہ کر وہ صرف اتنا اور کہہ سکی۔ کہ

"کیا میں کبھی کبھی حاضر ہو سکتی ہوں یہاں ——"

"کیا ملے گا آپ کو یہاں آ کر" جیون کی آواز میں کرب تھا۔

اور پھر وہ خلاؤں میں ادھر اُدھر اپنی بے نور نظریں پھیلا کر بولا۔

"قبرستان میں آ کر زندگیاں مسکراتی نہیں ہیں۔ آنسو بہاتی ہیں"۔

~~مسٹر جیون~~ —— ! مسز شہلا

جیون کے اس جواب پر شہلا جذبات سے بے قابو ہو کر کھڑی ہو گئی۔

اس دن کے واقعہ کے بعد سے میں ایک رات بھی سکون سے نہیں سو سکی"۔

اور شہلا جذبات کی رو سے یہ جملے ادا کرنے کے بعد یکدم چونک پڑی۔

اور پھر وہ گھبرا کر بولی۔

"اوہ: معاف کیجئے گا"

"دیکھئے —— کیا ——"

"جی میرا نام شعلہ ہے"

شہلا نے جیون کی مشکل حل کرتے ہوئے سے اپنا نام بتایا۔ اور جیون فوراً بول اُٹھا۔

"ہاں تو شہلا دیوی! اب آپ ہر رات کو سکون سے سو سکیں گی۔ میں نے آپ کو دل سے معاف کر دیا ہے"

"شکریہ —— !"

شہلا نے بڑی مایوسی کے ساتھ کہا۔ اور پھر وہ جیون پر ایک بھرپور نظر ڈالتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ بالکل ایک اس ہارے ہوئے جواری کی طرح جو اپنا سب کچھ ہار چکنے کے بعد قمار خانہ سے باہر نکل جاتا ہے۔

شہلا چلی گئی۔ اور جیون اس جگہ صوفہ کے پاس کھڑا نہ جانے کیا سوچتا رہا۔

شہلا نے کار اسٹارٹ کی۔ اور جیون کے کان اس آواز کو دیر تک سنتے رہے۔

شام کا وقت تھا۔ سورج کی شعاعیں سنہری ہو گئی تھیں اور پرند قطار اندر قطار فضاؤں میں اِدھر اُدھر تیرتے پھر رہے تھے اور نشیب میں جو جھیل تھی وہاں درختوں کے سائے کافی سے زیادہ طویل ہو گئے تھے۔ اور یہ طویل سائے جھیل کے صاف و شفاف پانی پر بہتے ہوئے لرز رہے تھے۔

قازوں کی بطوں کی قیں قیں سے فضاؤں میں ایک ہلکا سا ارتعاش پیدا ہو گیا تھا۔ اور دو پگڈنڈیوں کے بیچوں بیچ بھیڑ اور بکریوں کا ایک گلہ قصبہ کی طرف بڑھا چلا آرہا تھا۔ بکریوں کی مسلسل "میں میں" اور بھیڑوں کی "بھیں بھیں" گھٹے گھٹے انداز میں کانوں میں آرہی تھی۔ اور کبھی کبھی گڈریوں اور چرواہوں کی ہے۔ ہے اور اوہو اوہو کی آوازیں بھی کانوں سے آکر ٹکرا جاتی تھیں۔

اور اس خوشنما باغ کی ہر روش پر جو کہ ایک چھوٹی سی پہاڑی کو تراش کر بنایا گیا تھا۔ رنگا رنگ کے پھول مسکرا رہے تھے۔ اور روش کے پاس ہی جو ایک بجری کی خیط سی پگڈنڈی تراشی گئی تھی۔ اس پر ایک چھوٹا سا ٹٹو آہستہ آہستہ

بھاگ رہا تھا۔ اور اسی کے ساتھ ہی ساتھ اپنے ایک ہاتھ سے ٹٹو کی لگام اور دوسرے ہاتھ سے جیون کو سنبھالے ہوئے ایک سائیں دوڑ رہا تھا۔

ٹٹو اور سائیں دونوں قدرے ہانپ رہے تھے۔ اور ٹٹو کی پشت پر بیٹھا جیون مسکرا رہا تھا۔ اس کے چمکدار اور ملائم بال اس کی پیشانی پر بڑے خوبصورت انداز میں بکھر گئے تھے۔ اور وہ اسوقت اپنی ننھی برجس اور بلیزر میں بڑا دلکش دکھائی دے رہا تھا۔ جیسے کہ کسی پریوں کے دیش کا کوئی ننھا سا شہزادہ ہو۔

رائے بہادر صاحب کا مشکی بڑی تیزی کے ساتھ اس اونچی پہاڑی پر چڑھ رہا تھا۔ اور رائے بہادر صاحب رکاب دونوں پاؤں رکھے اس کی پشت پر کھڑے تھے۔

مشکی پہاڑی پر پہنچکر ہنہنایا اور رائے بہادر صاحب اسکی پشت پر سے نیچے اتر آئے۔ بڑے ادب سے جھک کر سائیں نے رائے صاحب کو سلام کیا۔

اور جیون نے اپنا ہاتھ ہوا میں بلند کر کے رائے بہادر صاحب سے کہا۔

"ہلو پاپا"

"ہلو جیون" رائے صاحب مسکرائے۔

"ہوتا ہے مقابلہ ہمارے مشکی سے"

"ابھی ہوتا ہے"

اور یہ کہکر جیون نے اپنے ٹٹو کو ایڑ لگا کر اس کے ایک زور سے ہنٹر رسید کیا۔ سائیں کے ہاتھ سے ٹٹو کی لگام چھوٹ گئی۔ اور وہ اپنی گردن کو

ایک زور کا جھٹکا دیکر پہاڑی سے نیچے نشیب کی طرف بھاگا۔

"ارے ۔۔ ! چھوٹے سرکار"

کہتا ہوا سامی ٹٹو کے پیچھے لپکا ۔ اور رائے بہادر صاحب اپنے مشکیں پر بیٹھ کر ٹٹو کے پیچھے دوڑے ۔ پہاڑی کا نشیبی راستہ بڑا خطرناک تھا ۔ جا بجا گڑھے تھے ۔ اور بڑے بڑے پتھر ادھر اُدھر بکھرے پڑے تھے! اور جیون کا ٹٹو تھا ۔ کہ بڑی تیزی سے دوڑ رہا تھا ۔

اور دیکھتے ہی دیکھتے ٹٹو ایک بڑے پتھر سے ٹکرایا ۔ اور ٹکراتے ہی وہ اوندھے منہ نیچے گر پڑا ۔ پتہ بھی نہ چلا کہ جیون ٹٹو کی پیٹھ پر سے کدھر گرا اور کہاں جا گرا ۔

کچھ دیر تک ٹٹو نشیب کی طرف لڑھکتا چلا گیا ۔ اور رائے بہادر صاحب گھبرا کر اپنے گھوڑے سے نیچے کو د پڑے ۔

وہ دیوانہ دار اپنے لخت جگر کو تلاش کر رہے تھے ۔ اور جیون ایک گڑھے میں اوندھے منہ پڑا تھا ۔ ایک خار دار پتھر سے اس کا نچلا ہونٹ پھٹ کر لہو لہان ہو گیا ۔

بڑی بے چینی سے وہ گڑھے میں کو د پڑے اور ان کے سائیس اور اہلکاروں نے مل کر جیون کو باہر نکالا ۔

جیون ان کی گود میں مسکرایا ۔

"ہم رسیں جیت گئے نہ پاپا!"

"میرا بہادر بیٹا ۔ انہوں نے جیون کو اپنے کلیجہ سے بھینچ لیا ۔

"میرا بیٹا جیون ہر بازی ایشور نے چاہا تو اسی طرح جیتتا رہے گا۔
سایئں کے چہرے پر خوف و ہراش کے آثار تھے۔ کہ جیون نے اس کی
طرف دیکھ کر کہا۔

"تم کیوں ڈر رہے ہو سایئں"

وہ بڑے پیار سے بولا۔

"تمہارا کیا قصور۔ وہ ٹٹو ہی بودا نکلا۔

ٹٹو دو دو پگڈنڈیوں پر سرپٹ گھر کی طرف بھاگا۔ چلا جارہا تھا۔

جیون نے غیر ارادی طور پر اپنا نچلا ہونٹ ٹٹولا۔ اور پھر وہ نہ جانے کس
خیال میں غرق ہو گیا۔ کہ اس کے نوکر نے اس سے آکر کہا۔

"صاحب غسلخانے میں پانی تیار ہے۔

"اچھا۔! وہ جیسے گہری نیند سے پھر چونک پڑا ہو۔

اور وہ پھر اپنی جگہ پر سے اٹھا۔ اس کی چال میں اس کے ماضی کی یادوں
کی جھلک تھی۔

آج جیون کی طبیعت ذرا کچھ یونہی کسلمندسی تھی۔ وہ دن کا کھانا کھا
کر لیٹ گیا۔ اور جب وہ شام کے چار بجے سو کر اٹھا تو اسے اپنے نوکر کی زبانی

معلوم ہوا کہ ولنگٹن کلب کا اسسٹنٹ مینجر اس سے ملنے کے لئے آیا تھا۔ اور اب شام کے پانچ بجے وہ پھر آئے گا۔

"یہ لوگ بھی ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئے ہیں۔"

جیون بڑبڑایا۔ اور پھر وہ اپنے نوکر سے بولا۔

"میں منہ ہاتھ دھوؤں گا۔ تم لوٹے میں پانی اور آفتابہ یہیں لیتے آؤ۔"

"ابھی لایا سرکار۔"

ہاتھ منہ دھو کر چائے پی رہا تھا۔ کہ اتنے میں ولنگٹن کلب کا مینجر آگیا۔

"Good Afternoon sir" اس نے آتے ہی جیون کی مزاج پرسی کی۔

"کیسی طبیعت ہے آپ کی۔"

"میں ٹھیک ہوں۔ شکریہ۔"

اور اخلاقاً اس نے اُٹھنے کی کوشش کی مگر مینجر نے اسے شانوں سے پکڑ کر بٹھا دیا "Don't Take Trouble" (تکلیف نہ کیجئے۔)

اور پھر وہ اپنے مطلب پر آگیا۔

"آج ایک ہفتہ سے آپ کلب نہیں آرہے۔ سچ پوچھئے تو کلب کی ساری رونق جاتی رہی ہے۔ تمام ممبر بری طرح آپ کی کمی محسوس کر رہے ہیں۔"

"شاید اب میں کلب کبھی نہ آسکوں گا۔ ممبروں سے کہہ دیجئے کہ میری کمی کو اپنے کسی اور مشاغل سے پوری کر لیں۔"

"دوپہر کو میرا اسسٹنٹ آیا تھا مگر ——"

جیون نے بات اُچک لی۔

"میں سو رہا تھا"

"جی آپ سو رہے تھے اُسوقت"

اور پھر کچھ دیر خاموش رہ کر مینجر دبی زبان سے بولا۔

میں کوشش کر کے آپ کو بارہ سو روپیہ ماہوار دلا دوں گا۔ دو سو روپیہ ماہوار کا اضافہ یقیناً ایک خوشگوار بات ہوگی"

"یہ بات نہیں مسٹر مارس" جیون نے میز پر اپنی دونوں کہنیوں کو ٹکا کر اپنی پیشانی کو اپنی دونوں ہتھیلیوں کے درمیان رکھ کر آہستہ سے کہا۔

"در اصل اب میں کچھ گھبرا سا گیا ہوں اس ماحول سے"

"مگر ہم آپ کو کسی قیمت پر نہیں چھوڑ سکتے"

"اچھا یونہی سہی۔ مہلت دے دیجئے۔ کچھ اور دنوں کے لئے"

"یہ بات منظور ہے"

اور پھر مسٹر مارس ولنگٹن کلب کے مینجر مسٹر جیون سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گئے۔ اور جیون کھوئے ہوئے انداز میں اپنے صوفہ پر اسی جگہ نیم دراز ہو گیا۔

وہ بہت کچھ سوچ رہا تھا اس وقت نہ جانے کیوں آج کئی دنوں سے وہ دن رات بہت کچھ سوچنے لگا تھا۔

رائے بہادر صاحب کی کوٹھی دلہن کی طرح سجی ہوئی تھی۔ جیون کی آٹھویں سالگرہ تھی۔ آج مہمانوں سے کوٹھی کا چپہ چپہ بھرا تھا۔ خوشیاں ہر چہار طرف سے امنڈ رہی تھیں۔ شادیانے بج رہے تھے۔ کہ اسی جشن شادمانی کے درمیان اندر زنان خانہ سے ایک عورت بھاگی ہوئی آئی۔ اور اس نے رائے بہادر صاحب کے کان میں کچھ کہا۔

"کیا کہا —— ؟

رائے بہادر صاحب کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ اور انہوں نے بڑی گھبرائی نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔

کیا بات ہے مالک" ان کے خاص ملازم نے گھبرا کر ان سے سوال کیا۔

خیر تو ہے"

"تم جلدی سے جا کر شہر کے بڑے ہسپتال سے کسی اچھی اور ہوشیار نرس کو لیکر فوراً آجاؤ۔

"بہت اچھا مالک" نوکر جاتے ہوئے بولا۔

"ابھی گیا اور ابھی آیا سرکار"

رائے بہادر صاحب کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں اور کرب بےچینی کے آثار ان کے چہرے سے صاف عیاں تھے۔ ان کی پیشانی پر پسینہ آگیا تھا وہ پاس پڑے ہوئے صوفہ پر گر گئے۔

مہمانوں کی ہاؤ ہو اسی طرح جاری تھی کہ تقریباً پندرہ منٹ کے بعد جبکہ وہ برانڈے میں بڑی بےچینی سے ٹہل رہے تھے۔ وہی ملازمہ بھاگی ہوئی پھر آئی اور وہ آتے ہی اضطراب کے عالم میں بولی۔

"غضب ہو گیا سرکار"

کیا ہوا — ؟ رائے بہادر صاحب کا دل ان کے حلق میں آکر پھنس گیا۔ ملازمہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اور وہ بھرائی آواز میں بولی۔ رانی صاحبہ —"

اور وہ آگے کچھ نہ کہہ سکی۔ رائے بہادر صاحب تقریباً چیخ کر بولے۔

"کیا ہوا تھا تمہاری رانی صاحبہ کو — ؟

"بہت برا ہوا مالک" ملازمہ اپنے ہونٹ کاٹنے لگی اور وہ چیخ کر رو دی۔

"رانی صاحبہ ہم سب سے سدا کے لئے روٹھ گئیں سرکار"

"کیا کہا — !

رائے بہادر صاحب دیوانہ وار زنان خانے کی طرف لپکے۔ اندر کہرام مچا ہُوا تھا۔ اور ان کے عزیز ترین بیوی کی نعش سفید چادر سے ڈھکی ہوئی تھی۔ اور پلنگ کے پاس ہی پنگوڑے پر ایک خوبصورت بچی گرم کپڑوں میں لپٹی ہوئی اپنی ننھی ننھی خوبصورت آنکھوں سے جگر جگر اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی

"میری شوبھا" کہہ کر رائے صاحب بچوں کی طرح پھوٹ کر روتے ہوئے اپنی بیوی کی نعش پر گر پڑے۔

اور وہی گھر اور وہی ماحول جس میں ابھی چند منٹ پہلے خوشیاں اور مسرتیں اُمڈی پڑ رہی تھیں، ماتم کدہ بن گیا۔ شادمانیوں نے دم توڑ دیا۔ اور زخموں کی گھٹاٹوپ تاریکی میں پورا ماحول ڈوب گیا۔

رائے بہادر کو اتنا رنج ہُوا کہ انہیں سکتہ ہو گیا۔ اور بیوی کی روتے روتے ہچکیاں بند گئیں۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے آناً فاناً ہر چیز کی کایا پلٹ گئی۔

وہ مہمان جو خوشی کی محفل میں شریک ہوتے آئے تھے ماتم کے شریک بن گئے اور پورے قصبہ بھیر پور پر موت کی سی خاموشی چھا گئی۔ غموں کے بھیانک سناٹوں میں ہر دل ڈوب گیا۔ اور ہر آنکھ روتے روتے ویران ہو گئی۔

ایشور کی لیلا کتنی نیاری ہوتی ہے۔ آج اس حقیقت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر لوگوں کو اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ ہونی ہو کر رہتی ہے۔ اور بُری گھڑی کی بابت کبھی کوئی نہیں جانتا۔ کس کو کیا پتہ کہ مسرتوں اور شادمانیوں کے چمکتے ہوئے آفتاب پر کب اور کس وقت غم و الم کی گھٹائیں چھا جائیں اور مسرت بھرے دل پر کب رنج و مصیبت کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں گے۔ اس کی بابت

کسی کو کیا معلوم۔

جیون ماں کی ممتا کھو کر نڈھال ہو چکا تھا۔ اور نو زائیدہ بچی بھلا کو یہ تک نہ معلوم ہو سکا کہ ماں کیا چیز ہوتی ہے۔ اور اس کی ممتا کس چڑیا کا نام ہے۔ اس غریب نے تو ماں کی شکل تک نہ دیکھی تھی۔ ممتا کو پہچانا تک نہ تھا۔ اس نے۔

غموں کا احساس اس وقت ہوتا ہے۔ جب خوشیوں کے جنازے اپنی آنکھوں کے سامنے نکل جائیں۔

اور اتنے سال بیت چکنے کے بعد بھی غم کا یہ احساس جیون کے دل سے دور نہ ہوا تھا۔ وہ یہی یہ سب کچھ سوچتے سوچتے یکبارگی اپنے دل کو تھام کر صوفہ پر سے بیتابانہ اٹھ بیٹھا۔ وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے دل کو تھامے ہوئے تھا۔ کہ اس کا ملازم آ گیا۔

اور وہ آتے ہی اپنے مالک کو اس حال میں دیکھ کر تڑپ اٹھا۔

"کیا ہوا سرکار" وہ بیتابانہ جیون سے پوچھ رہا تھا۔

"کیا تکلیف ہو رہی ہے آپ کو؟"

"کچھ نہیں دوست" ایک سرد آہ کے ساتھ جیون نے یہ جملہ ادا کیا۔ اور پھر وہ اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا۔

ایک گلاس پانی" "ابھی لایا سرکار"

ملازم بھاگ کر گیا اور جیون نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر اپنا سر صوفہ کی پشت سے ٹکا دیا۔

رائے بہادر کے دل میں باپ کی محبت کا جذبہ کچھ یوں بھی کم نہ تھا اور پھر شوبھا کے مرجانے کے بعد سے تو وہ اور بھی اپنے اِن دو بچوں پہ جان چھڑکنے لگے تھے۔ اگر بملا ذرا سا بھی رو دیتی تو وہ ساری کوٹھی سر پہ اُٹھا لیتے۔ نوکروں پر ڈانٹ پڑتی کہ انہیں چھٹی کا دودھ یاد آجاتا۔ انہوں نے اپنی بیٹی بملا کیلئے ایک چھوٹا پیالہ چار آیائیں رکھ چھوڑی تھیں۔ اور نوکر چاکر یا ملازمائیں اس کے علاوہ تھیں۔

اگر گورنس تھی جو جیون اور بملا کی تعلیم و تربیت کا بطور خاص خیال رکھتی اور اس گورنس انہوں نے ایک بڑے شہر سے اشتہار دیکر بلوائی تھی۔ اور اس کے سارے اخراجات کفیل تھے۔ اور اُن اخراجات کے علاوہ تین سو روپیہ ماہوار اسے ہر ماہ علیحدہ سے ملتے تھے۔ اسکے رہنے کیلئے کوٹھی بھی معقول انتظام الگ تھا۔

جیون شہر کے انگلش ہائی اسکول میں سونتھ اسٹینڈرڈ میں پڑھتا تھا۔ اور بملا جس کی عمر ابھی صرف چھ سال کی تھی کوانونٹ میریز میں پڑھتی تھی اور یہ دونوں روزانہ اپنی کار پر بیٹھ کر گورنس کے ساتھ شہر کے اسکول میں جاتے اور شام کو اسی کار پہ واپس آجاتے تھے۔ قصبہ میں شہر کا فاصلہ بائیس میل تھا۔

شوبھا کے سورگباش ہو جانے کے بعد رائے بہادر صاحب کی زندگی کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہ تھا۔ کہ وہ اپنے ان دو معصوم بچوں کے لئے زندہ رہیں۔ اور وہ واقعتاً زندہ بھی اسی لئے تھے۔ ورنہ شاید وہ کب کے خودکشی کر چکے ہوتے۔ اس لئے کہ انہیں اپنی بیوی شوبھا سے بھی بے پناہ محبت تھی۔ ایک ایسی محبت جو عشق کا درجہ رکھتی ہو۔

اور یہی وجہ تھی کہ شوبھا کے مر جانے کے بعد سے رائے بہادر صاحب کی زندگی میں نمایاں انقلاب آ چکا تھا۔ انہوں نے اپنی تمام دلچسپیاں ختم کر دی تھیں۔ وہ دن رات صبح و شام بس اسی ادھیڑبن میں رہتے کہ کس طرح اُن کے دونوں بچے پروان چڑھ جائیں۔ اور کس طرح وہ ان اپنے دونوں بچوں کو دنیا کا ہر علم اور ہر ہنر سکھا دیں۔ وہ اپنے بچوں کو دنیا کا بہتر سے بہتر انسان بنتے دیکھنا چاہتے تھے۔

رائے بہادر صاحب کو گھوڑوں کا بے حد شوق تھا۔ مگر بیوی کی جدائی کے غم نے انہیں اس طرف سے بھی بے نیاز کر دیا تھا۔ اپنے اصطبل کے سارے گھوڑے وہ دوستوں میں بانٹ چکے تھے۔ ماسوا مُشکی کے جو انہیں اپنی جان سے زیادہ عزیز تھا۔

شکار پر وہ جان دیتے تھے۔ مگر اب برسوں گزر جاتے تھے اور وہ شکار کا خیال تک نہ لاتے اپنے دل میں بندوقیں بیکار پڑی تھیں اور انہیں زنگ

لگتا جا رہا تھا۔

پہلے وہ شطرنج اور ریجیپی پر جان دیتے تھے۔ مگر اب یہ محفلیں بھی ویران ہو چکی تھیں شوبھا کے انتقال کے بعد شاید ہی کوئی ایسا دن آیا ہو کہ وہ شطرنج یا چوپی کی طرف متوجہ ہوئے ہوں۔

اور یہی وجہ تھی کہ ان کے عزیزوں میں چہ میگوئیاں شروع ہو چکی تھیں کہ محض ان کا دل بہلانے کی خاطر ان کی دلبستگی کیلئے انکی دوسری شادی کر دی جائے۔

اور اس معاملہ میں ان کی دور کی رشتہ دار کی بہن پیش پیش تھی۔ انہوں نے بہترا کوشش کی رائے بہادر صاحب کو وہ کسی نہ کسی طرح اسبات کیلئے ہموار کر لیں۔ مگر ان کی اس قسم کی ہر کوشش خود ان کی جدوجہد کا کھلا ہوا انداق بن کر رہ گئی

وہ بہادر صاحب کے ہاں مہمان بنکر آئیں۔ اور رائے بہادر صاحب نے دل کھول کر بہن کا خیر مقدم کیا وہ: ان کے سامنے بچھ بچھ گئے۔

اور ایک دن موقع نکال کر وہ رائے بہادر صاحب سے گویا اپنے مقصد کی بات منوانے پر تل گئیں۔

رات کا کھانا کھا چکنے کے بعد وہ اپنا چھوٹا سا پاندان لیکر رائے بہادر صاحب کے پاس ان کے کمرے میں آکر بیٹھ گئیں۔ اور بہت سی ادھر ادھر کی باتوں کے بعد وہ باتوں باتوں میں کہنے لگیں۔

"بھائی جی سچ پوچھئے تو اب آپ کے یہاں آکر مجھے بڑی تکلیف ہوتی ہے"

"کس بات کی تکلیف شکنتلا" رائے بہادر صاحب حقہ کی منہ نال کو

اپنے ہونٹوں سے جدا کرتے ہوئے بولے۔

"تم آ جاتی ہو تو جیسے مجھے میری کھوئی ہوئی خوشیاں واپس مل جاتی ہیں۔"

"ایک بات کہوں بھائی جی برا تو نہ مانیئے گا؟"

"ضرور کہو شگفتہ" وہ بڑے پیار سے بولے "تم جیسی پیاری بہن کی کس بات کا میں نے برا مانا ہے بھلا؟"

شگفتہ بولی۔

"مرد اپنی کھوئی ہوئی خوشیوں کا ماتم زندگی بھر نہیں کرتے۔"

"پھر رائے بہادر نے ایک سرد آہ کھینچی۔

"ماتم کے سوا اور اب ہو بھی کیا سکتا ہے۔ بھگوان کی مرضی میں کسے دخل ہے۔"

"آپ میری ایک بات مانیئے بھائی جی۔"

"وہ کیا ——؟"

"آپ محض میری خاطر مجھے ایک بھابی پھر سے لا دیجئے۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہو شگفتہ"؟ رائے صاحب بے چین ہو کر اٹھ بیٹھے۔

"ایسی بات تمہیں نہ کرنی چاہیئے تھی۔

اور پھر رائے بہادر صاحب آبدیدہ ہو کر بولے۔

"شوبھا کے بعد میں کسی دوسری استری کا سایہ بھی اپنے لئے پاپ سمجھتا ہوں۔

"یہی تو بھول ہے آپ کی" شگفتہ سنبھل کر بولی۔

"ہر بیماری کا علاج ایشور نے بنایا۔ اور مرہم ہر زخم کا دنیا میں موجود ہے۔

"مگر شگفتہ" رائے بہادر صاحب ایک بہت ہی گہرا سانس لیکر بولے
"بہت سے زخم ایسے ہوتے ہیں جو ناسور بن جانے کے لئے ہی پیدا ہوتے
ہیں - اور جنکا علاج دنیا میں سوا موت کے اور کسی چیز سے ممکن نہیں ہوتا"
"میں نہیں مانتی اس بات کو بھائی جی" شگفتہ بڑے وثوق سے بولی -
"جیسے ہر زخم کا مرہم خود بخود بن جایا کرتا ہے -
"ہو سکتا ہے کہ تمہاری کہی ہوئی بات درست ہو شگفتہ مگر میں اس
کا علاج کیا کروں - کہ میرا دل اور دماغ اس قسم کے علاج پہ جیسا کہ تم بتا
رہی ہو آمادہ جو نہیں ہوتا"
"یہ سب کہنے کی باتیں ہیں" شگفتہ اور زیادہ زور دیتے ہوئے بولی -
"آپ نے کبھی سوچی ہی نہیں ہے یہ بات"
"اور میں اس قسم کی بات سپنے میں بھی سوچنا نہیں چاہتا"
"ہوئی نہ وہی بات" شگفتہ نے جرح کی "آپ خود نہیں چاہتے یہی
بات تو اتنے دنوں سے میں خود کہہ رہی ہوں آپ سے"
"شگفتہ - !" رائے بہادر صاحب عاجزی سے بولے -
"تم اس قسم کی باتوں کو نہ چھیڑا کرو - میرے سامنے دل کے آبلے پھوٹ
پڑتے ہیں - ان باتوں سے"
"مگر دیکھیئے نہ بھائی جی ——"
"شگفتہ - رائے بہادر صاحب نے اپنی بہن کی بات پوری ہونے سے
پہلے ہی کاٹ دی -

"کیوں دکھ دے رہی ہو مجھے!"

اور یہ بات رائے بہادر صاحب نے کچھ اس ڈھنگ سے کہی کہ نکہت کی ہمت بالکل ہی جواب دے گئی۔ اور وہ کچھ چوری بن کر ادھر اُدھر نظریں چھپا سکنے پر مجبور ہو گئی۔

اور ایک محبت کرنے والی بہن کا یہ عزم کہ وہ اپنے بھائی کو دوسری شادی کرنے پر شرطیہ آمادہ کر لے گی۔ دھول میں مل گیا۔ وہ منہ دیکھتی رہ گئی اپنے بھائی کا۔

اور پھر اس سلسلہ میں، اس خاص موضوع پر وہ اپنے بھائی سے کبھی گفتگو نہ کر سکی۔

صبح کا وقت تھا۔ اور رائے بہادر صاحب اپنی کوٹھی کے بڑے ہال میں اپنی بیوی کی بڑی تصویر کے سامنے کھڑے تھے۔ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں اور وہ اپنی بیوی سے گویا بڑے رازدارانہ طور پر باتیں کر رہے تھے۔

"شوبھا —! میری اچھی شوبھا۔ کاش تم آج زندہ ہوتیں اور تم یہ دیکھ سکتیں کہ میں نے تمہاری دی ہوئی دونوں امانتوں کو کس ڈھنگ سے بچایا ہے۔ دیکھو تمہارے بعد میں نے اب تک دوسرا بیاہ نہیں کیا۔ اور میں اب تمہارے سامنے یہ ایشور کی سوگند کھا کر کہتا ہوں کہ مرتے دم تک اپنا دوسرا بیاہ نہ کروں گا۔"

سوبھا —! تم کہاں ہو میری رانی! کس دنیا میں کھو گئی ہو تم۔ جو تم تک میری آواز نہیں پہنچتی۔ میں تمہارے لئے دن رات تڑپتا ہوں۔ تمہاری صرف ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے لئے میری زندگی کے اتنے بہت سے سال تڑپتے اور ترستے ہوئے بیت گئے ہیں۔

تمہیں کیا بتاؤں شوبھا۔ اور کیسے بتاؤں میں۔ کہ تمہارے بغیر میری زندگی
کا ہر سانس میرے لئے زندگی کے ستر ہزار سالوں کی کربناکیوں کے برابر ہے۔
اور اب تمہارے بغیر میں اس دنیا کے دکھ میں اور زیادہ دنوں تک نہیں ٹھہر سکتا۔
تم مجھے کچھ ذمہ داریاں سونپ کر گئی تھی۔ اور اب میں تمہاری دی ہوئی ان
ذمہ داریوں سے سبکدوش ہوا جاتا ہوں۔ تمہارے ہونہار اور لائق بیٹے جیون
نے ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ بی کی ڈگری حاصل کرلی ہے۔ اور اب وہ اور زیادہ پڑھنے
کے لئے ولایت جا رہا ہے۔ اور تمہاری بیٹی اب انٹرنس پاس کرکے انٹرمیڈیٹ
میں آگئی ہے۔ بڑی ہوشیار ہے۔ تمہاری بیٹی۔ بڑی سمجھدار ہے۔ اور بڑی
سلیقہ کی ہے۔ اور ہاں جانتی ہو تم وہ بالکل تمہاری ہم شکل ہے۔ بالکل تم ——
بملا کی شادی ہو جائے گی۔ اور جیون کی بھی۔ اور پھر رانی! میں تمہارے
فرائض سے سبکدوش ہو جاؤں گا۔ اور پھر تم مجھے اپنے پاس بلا لینا۔ اسلئے کہ اب
بغیر تمہارے تو مجھ سے ایک پل کے لئے بھی رہا نہیں جاتا۔ بہت تو جی لیا تم
سے بچھڑ کر۔ اور کب تک مرنے کے انتظار میں جیتا رہوں گا۔ بغیر تمہارے۔
رانی! بلالو اپنے داس کو اب اپنے پاس ——

اور یہ کہکر رائے بہادر صاحب پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ وہ اتنا بے خبر
ہوئے کہ انہیں اس بات کا احساس بھی نہ رہا کہ ان کی اس حالت کو
کہیں کو اور نہ دیکھ لے۔

اور ابھی وہ اپنے بےچین و بیقرار آنسوؤں کو اچھی طرح پی بھی نہ سکے تھے
کہ جیون اور بملا کھلکھلاتے ہوئے ہال میں داخل ہوئے۔

اور انہیں اس طرح اچانک آتے ہوئے دیکھ کر رائے صاحب جلدی جلدی اپنے آنسوؤں کو اپنے دونوں ہاتھوں سے مل مل کر خشک کرنے لگے۔ خواہ مخواہ کی مسکراہٹ انہوں نے اپنے چہرہ پر جمع کی۔

اور اب وہ گویا اپنے بچوں کے استقبال کیلئے تیار ہو چکے تھے۔ وہ یکبارگی گھوم گئے۔ اور قبل اس کے کہ وہ کچھ بولیں۔ جیون اور بملا ان کی اسوقت کی اس پریشان حالی اور بیقراری کو بھانپ گئے۔

"ارے —! یہ کیا پاپا —!!"

وہ دونوں ایک ساتھ دوڑے اور اپنے باپ سے لپٹ گئے۔

"یہ کیا ہو گیا ہے آپ کو" جیون نے سوال کیا۔

"آپ روئے کیوں تھے پاپا؟ بتلایئے نا؟" بملا اپنے باپ سے پوچھ رہی تھی۔

"کچھ تو نہیں —" رائے بہادر صاحب بچوں کی طرح ٹھنک کر بولے جیسے کہ وہ ان دونوں کا مذاق اُڑا رہے ہیں۔

"بڑے بگلے ہو تم لوگ"۔

"دیکھئے پاپا —" جیون تُتلاتا ہوا بولا "آپ اگر اس طرح کڑھتے رہے تو سچ کہہ رہا ہوں۔ کہ میں سچ مچ پاگل ہو جاؤں گا۔ ایک نہ ایک دن سمجھ لیجئے ناں —"

"اور میں تو سب سے سادھے آتم ہتھیا کر لوں گی، صاف بات ہے!" بملا نے آنکھیں مٹکائیں۔

"نہیں بابا" رائے صاحب نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"تم لوگ تو بس یوں ہی ہو بڑ ہو۔ تم جیسے پیارے بچوں کے ہوتے ہوئے
میں رو ؤنگا بھلا۔ کیا دکھ ہو سکتا ہے مجھے"

"دیکھئے ماتا جی ــــ!"

جیون نے اپنے ماں کی تصویر کیطرف ٹھکا ٹکا دیکھا۔

"آپ کے لئے پاپا اتنا دُکھی ہوں۔ یہ بات مجھے کم از کم اچھی نہیں لگتی"

"اور مجھے کہاں اچھی لگتی ہے بھیّا" بملا شوخی سے بولی۔

"ہم لوگوں سے زیادہ پاپا جی ماتا جی کو چاہتے ہیں"

"پگلی کہیں کی ــــ"

رائے بہادر صاحب نے پیار سے بملا کے سر پر ایک دھپ جمائی۔

"بڑی شریر ہو گئی ہے اب تو تو ــــ"

اور پھر وہ دل سے مسکرائے۔

"بڑی باتیں بنانی آ گئیں ہیں۔ اب تو بھئی ہماری رانی بیٹی کو"

انھوں نے بملا کو غور سے دیکھا۔

"کیوں ــــ!"

اور بملا آپ ہی آپ شرما کر بھاگ گئی۔

"کتنی شریر ہے یہ ــــ"

رائے بہادر صاحب نے جیون کی طرف دیکھ کر کہا۔ اور جیون بغیر
اس بات کا جواب دیئے ہوئے بولا۔

"آپ کو اتنا زیادہ پریشان نہ ہونا چاہیئے۔ آپ کی صحت پر اس

کا بڑا اثر پڑ رہا ہے"

"اچھا بابا اچھا — " رائے بہادر صاحب مسکرائے"۔

"اب نہ ہوں گے پریشان"

اور پھر انہوں نے جیون کے شانوں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ دیے۔

"تم جیسی ہونہار اولاد جس خوش نصیب کے ہو اُسے اور کیا چاہیئے۔ دنیا میں"

وہ بے حد جذباتی ہو گئے۔ مگر فوراً ہی وہ پھر سنبھلے۔

"اچھا چلو — تمہارا ناشتہ ہمارے انتظار میں پڑے پڑے سوکھ رہا ہو گا"

ولنگٹن کلب میں آج بڑی ہماہمی تھی۔ بڑے بڑے اور خوبصورت ہاتھ سے لکھے ہوئے دو رنگے اور سہ رنگے پوسٹروں کے ذریعہ اعلان کیا گیا تھا کہ آج مسلسل دس دن کی غیر حاضری کے بعد مسٹر جیون کلب میں رونق افروز ہونگے۔ اور سامعین ان کی اس کمی کو بھول جائیں گے۔ جو ان دونوں میں وہ بغیر جیون کے محسوس کرتے رہے ہیں۔

اور ساتھ ہی یہ بھی اعلان کیا گیا تھا کہ آج کے پروگرام میں مسٹر جیون کا بہت ہی اہم اور خاص حصہ ہوگا۔ لوگ جوق در جوق کلب میں جمع ہو رہے تھے۔ قیمتی اور خوبصورت موٹر کاروں سے کلب کا پورا احاطہ گھر گیا تھا۔ اور پورٹیکو میں کاروں کو رکنے کی جگہ نہیں مل رہی تھی۔

زرق برق لباس سے آنکھیں خیرہ ہوئی جارہی تھیں۔ اور ہیرے جواہرات کی چمک دمک پورے ماحول میں تابندگی کی روح پھونک رہی تھی۔ شراب کا دور چل رہا تھا۔ اور سرشار جوانیاں ساز کی ہلکی دھن پر

کی لہروں میں تیر رہی تھی اور ایک دوسرے پہ مدغم ہوتی جا رہی تھیں۔
شہلا بلوریں میز پہ اپنی دونوں کہنیاں ٹکائے۔ اپنی بڑی بڑی غلافی آنکھوں کو اسٹیج کی طرف جمائے ہوئے تھی۔ اس کا گلنار چہرہ اس کی مخروطی ہتھیلیوں کے بیچ اس طرح دکھائی دے رہا تھا کہ جیسے قرآن رحل پہ کھلا رکھا ہو۔ یا جس طرح کہ گلدان میں رکھا ہوا گلاب کا پھول مسکرا رہا ہو۔ جیسے کہ ایک شمع ہو جو فانوس کے درمیان جھلملا رہی ہو۔ جیسے کہ ایک آبدار ہیرا ہو۔ جو انگوٹھی کے کنگروں سے باہر جھانک رہا ہو۔
تالیوں کی ہلکی گونج کے درمیان ملی ٹنسی ختم ہو گیا۔ خوردہ اور خوش پوش جوڑے اپنی اپنی جگہوں پہ آکر بیٹھ گئے۔ کہ مسٹر مارس کی آواز لوگوں کے کانوں میں گونجی۔

لیڈیز اینڈ جنٹلمین! اب ہم بڑے فخر و انبساط کے ساتھ مسٹر جیون سے درخواست کریں گے۔ کہ وہ آپ کے سامنے اپنا سب سے زیادہ پسندیدہ نغمہ پیش کریں۔

مسٹر جیون!
اسٹیج کا ریشمی پردہ وائلن کے میٹھے میٹھے سروں کے ساتھ آہستہ آہستہ سرکنا شروع ہوا۔ اور پورے ہال میں بڑے جوش کے ساتھ تالی بجائی گئی۔ شہلا بے چین ہو کر کھڑی ہو گئی۔ اسٹیج کے بیچوں بیچ ایک کرسی پہ جیون وائلن اپنے بائیں شانے سے لگائے ہوئے انہماک سے ایک حسین راگ چھیڑ رہا تھا اور پھر اس کی دلسوز آواز فضا میں گونجی۔

دل مہجور کو تسکین کا ساماں نہ ملا
شہر جاناں میں کہیں مسکن جاناں نہ ملا

کو بہ گردی میں کٹیں شوق کی کتنی راتیں
پھر بھی اس شمع تمنا کا شبستاں نہ ملا

یوں تو ہر راہ گذر پر تھے ستارے رقصاں
جس کی حسرت تھی مگر وہ مہ تاباں نہ ملا

جس پہ پردوں سے مچلتی ہو وہی نکہت شوق
بیخودی کی قسم ایسا کوئی ایواں نہ ملا

یوں تو ہر راہ گذر پہ تھے ۔ ستارے رقصاں
جسکی حسرت تھی مگر وہ مہ تاباں نہ ملا

جسکے پردوں سے مچلتی ہو وہی نکہت شوق
بیخودی کی قسم ایسا کوئی ایواں نہ ملا

یوں تو ہر در پہ جھکتے نظر آئے دامن
کھینچتے ناز سے جسکو وہی داماں نہ ملا

(اختر شیرانی)

سامعین سر دھننے لگے اور شہلا کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے وہ دیوانہ وار تالی بجا رہی تھی۔ کہ انہیں تالیوں کے شور کے درمیان جیون نے پیانو کے ساز پر اپنا دوسرا نغمہ چھیڑا۔

غم حسینوں کا حسینوں کی جدائی بھی
دیکھیں دکھلائے ابھی گردش دوراں کیا کیا

دشت غربت میں رلاتے ہیں ہمیں یاد آکر
اے وطن تیرے گل و سنبل و ریحاں کیا کیا

ہے بہار گل و لالہ میرے اشکوں کی نمو
میری آنکھوں نے کھلائے ہیں گلستاں کیا کیا

(اختر شیرانی)

اشعار میں بلا کی گرمی تھی اور بلا کی اضطرابی اور پھر جیون کی دلسوز آواز نے غم کی اس محرومی پر پورے ہال کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ اور شہلا کا دل جیون کی خاطر اس کے پہلو میں بلیوں اچھلنے لگا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا۔ کہ جیسے جیون کی اپنی روداد ہو جسے وہ زمانے کی داستان بنا کر دہرا رہا ہے۔

اس کا جی جیون کے لئے بے اختیار مچلا۔ ور وہ تڑپ گئی بے چین ہو گئی۔ وہ اور پھر وہ غیر ارادی طور پر جیون کے قریب آ گئی۔ اور اس نے اس کے بالکل نزدیک پہنچکے بڑی گرمجوشی سے اس کا ہاتھ دبایا۔

"مسٹر جیون ——:"

"اس کی آواز لرز رہی تھی۔ ہونٹ پھڑ پھڑا رہے تھے۔ اور آنکھوں میں آنسوؤں کے ابدار موتی جگمگا رہے تھے۔

"کون —— !

اور قبل اس کے شہلا اپنے ہوش و حواس جمع کر کے اسے جواب دے وہ خود ہی بولا ——

"اوہ! تو آپ ہیں"

"جی —— !

اور شہلا کی اس "جی" میں بڑی بیچارگی اور بڑی مایوسی تھی۔

اور پھر اور بہت سے لوگوں نے بھی آ کر جیون کو گھیر لیا۔ شہلا وہاں سے ہٹ آئی اور پھر وہ وہاں رکی بھی نہیں۔ اس نے کلب سے نکلکر سیدھے اپنے گھر کی راہ لی۔

صاف شفاف اور سنسان سڑک پر اسکی کار چالیس میل کی رفتار سے اس کے گھر کی طرف بھاگ رہی تھی۔

ابھی صبح کے ساڑھے سات بجے تھے کہ شہلا تیار ہو کر اپنے گھر سے نکلی۔ اور ابھی وہ ملازم کو گیراج سے گاڑی نکالنے کا حکم دے ہی رہی تھی کہ اس کی بہن نے باہر نکل کر اس سے پوچھا۔

"اتنی صبح! آخر تم جا کہاں رہی ہو ——؟"

"میں۔ اجی ——! مجھ سے پوچھا آپ نے دیدی۔؟"

اور کوشلیا۔ اس کی اس گھبراہٹ پر خفیف سا مسکرائی۔

"ہاں میں تم سے یہی سوال کر رہی ہوں۔"

"کیا آپ مجھ پر شک ہے دیدی ——؟" "یہ میرے سوال کا جواب تو نہ ہوا۔"

"تو سمجھ لیجئے کہ میں غلط نہیں جا رہی ہوں۔"

"پھر بھی ——"

"میں مسٹر جیون کے ہاں جا رہی ہوں۔"

اور شہلا کے اس صاف جواب پر اس کی بہن نے کچھ سوچ کر کہا۔

"جاؤ۔"

"میں ابھی واپس آجاؤنگی۔"

"میں چائے پی چکی ہوں۔"

اور یہ کہکر برآمدے میں اتر آئی۔ پورچ میں ڈرائیور نے گاڑی لا کر کھڑی کر دی تھی۔ وہ گاڑی پر بیٹھی۔ اور اس کی گاڑی تیزی کے ساتھ نیم دائرہ بناتی ہوئی بنگلے سے باہر نکل گئی۔

جس وقت شہلا جیون کے گھر کے سامنے پہنچکر اپنی کار سے نیچے اتری تو اتفاقاً اس وقت جیون کا نوکر وہیں باہر ہی کھڑا ہوا اسے مل گیا، اور وہ شہلا کو دیکھ کر مسکرایا۔
"نمستے مس صاحبہ" وہ دانت نکالے شہلا کی کار کے پاس آیا۔

"صاحب ہیں تمہارے"

اور نوکر نے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے مسکرا کر جواب دیا۔

"تشریف لائیے مس صاحبہ۔ صاحب گھر پر ہی ہیں"

"وہ ملنا پسند کریں گے مجھ سے" شہلا کار سے باہر آتے ہوئے بولی۔

"انہوں نے مجھ سے کہا تو تھا کہ آج وہ کسی سے ملنا نہیں چاہتے" نوکر مسکرایا۔

"مگر آپ تو بس چپکے چپکے چلی آئیے میرے ساتھ"

"بڑے اچھے ہو تم" شہلا مسکرائی۔

اور جیون کا ملازم دانت نکال کر مسکرانے لگا۔

"جی غلام ہوں آپ کا سرکار"

اور پھر وہ اندر جاتے ہوئے بولا۔

"میں چاہتا ہوں کہ آپ روز آیا کریں صاحب سے ملنے"

"یہ کیوں ـــ؟ یہ تم کیوں چاہتے ہو؟"

"میں چاہتا ہوں کہ صاحب کو کوئی دل سے اپنا سمجھے" نوکر بڑی سنجیدگی سے بولا۔

"اور آپ انہیں دل سے اپنا سمجھتی ہیں۔ صاحب سے مجھے بڑی محبت ہے۔ وہ بڑے اداس رہتے ہیں بے چارے"

"اور اگر تمہارے صاحب نے ڈانٹ کر مجھے گھر سے نکال دیں تو"

"تو آپ برا نہ مانئے گا مس صاحبہ۔ صاحب دل کے برے بالکل نہیں ہیں"

"اچھا تو ایک کام کرو" شہلا رک کر بولی "میں اندر چلتی ہوں۔ مگر تم میرے آنے کی اطلاع اپنے صاحب کو نہ دینا سمجھے!"

"جی سمجھ گیا مس صاحبہ"

اور پھر وہ دونوں دبے پاؤں اندر آ گئے۔ شہلا ڈرائینگ روم میں آ کر ایک صوفہ پر بیٹھ گئی۔ نوکر اندر باورچی خانہ میں کسی کام سے چلا گیا کہ بیڈ روم سے آواز آئی۔

"رامو! منہ دھونے کا سامان لے کر آؤ"

یہ جیون کی آواز تھی۔

"ابھی لایا صاحب" رامو نے باورچی خانہ سے نکلتے ہوئے جواب دیا۔ اور جب رامو پانی کا جگ۔ صابن۔ تولیہ اور آفتابہ لیکر اندر جانے لگا تو یہ تمام چیزیں شہلا نے اس سے خود لے لیں۔ اور وہ دھیرے سے بولی۔

"آج تمہارا کام میں کروں گی"

"بڑی خوشی سے"

اور یہ تمام چیزیں لئے ہوئے اندر پہنچی۔ اور جیون ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا

"آ گئے رامو" اس نے پوچھا۔

"جی صاحب" رامو نے جواب دیا۔

اور پھر شہلا جیون کے ہاتھ پر پانی ڈالنے لگی۔ اس نے اسے صابن دیا پیسٹ دی اور پھر تولیہ آگے بڑھا دیا۔ جیون ہاتھ منہ دھو کر بولا۔

"اب میں باہر ڈرائننگ روم میں چل کر بیٹھتا ہوں۔ تم اتنی دیر میں ناشتہ تیار کر کے لے آؤ۔"

جیون اپنے پیروں سے اپنے سلیپر تلاش کرنے لگا۔ کہ شہلا نے آگے بڑھ کر سلیپر اس کے پاؤں میں پہنا دیئے۔ جیون کمرے سے نکل کر ڈرائننگ روم میں آ گیا۔ اور دبے پاؤں شہلا بھی باہر آ گئی۔

باہر نکل کر وہ سیدھے باورچی خانہ میں گئی۔ اس نے رامو سے کہا کہ آج کا ناشتہ وہ خود تیار کرے گی۔ اور وہ رامو کی منظوری کا انتظار کئے بغیر ناشتہ کی تیاری کرنے لگی۔

اس نے جلدی جلدی دو تین پراٹھے تیار کئے۔ انڈے ابالے ٹوسٹ سینکے اور پھر ان پر مکھن لگانے لگی۔ اور پھر ناشتہ تیار کر کے وہ ان چیزوں کو سلیقہ کے ساتھ ایک کشتی میں لگا کر باہر لے آئی۔ جیون وقت گزاری کے لئے پیانو پلے کر رہا تھا۔ شہلا کے قدموں کی آہٹ پر وہ بولا۔

"آج تو بڑی جلدی ناشتہ تیار ہو گیا رامو"

وہ اپنی جگہ پر سے اٹھا۔ اور ناشتہ کی میز پر آ گیا۔ اور اتنی دیر میں شہلا ٹوسٹ پر جام لگا چکی تھی۔

"بڑے خستہ اور مزید ار قسم کے پراٹھے بنے ہیں۔ آج تو ـــ"

وہ اپنی آنکھوں کو پٹ پٹاتے ہوئے بولا ـ

آخر بات کیا ہوئی آج "

"جی کوئی بات نہیں" رامو جھینپے سے بولا ـ

ادھر شہلا نے توسٹ کی پلیٹ جیون کی طرف بڑھا دی۔ اس نے توڑوں کر ایک ٹوسٹ اٹھا لیا ـ

"ارے! یہ ٹوسٹ بنانے تو نے کس سے سیکھے رامو ـ

وہ منہ چلاتے ہوئے بولا ـ

"آج تجھے یہ ہو کیا گیا ہے"

"کچھ تو نہیں صاحب"

"ضروری کوئی انہونی بات ہوئی ہے" جیون نے دوسرا ٹوسٹ اٹھاتے ہوئے کہا ـ

"ورنہ تو۔ تو اتنے بڑے توسٹ بناتا تھا کہ توبہ بھلی"

اور وہ چائے کا ایک گھونٹ لیتے ہوئے بولا ـ

"اور یہ چائے ـــ!"

"وہ جیسے کچھ انداز لگانے لگا ـ

"تو نے ہرگز نہیں بنائی چائے"

اس نے کپ نیچے رکھ دیا ـ

"اور تو نے آج یہ ناشتہ بھی خود نہیں بنایا"

رامو سہم گیا ۔ اور شہلا کچھ گھبرا سی گئی ۔ کہ جیون مسکرایا ۔

"بھئی رامو تونے کل بھی اسی طرح کا ناشتہ دیا تو میں تیرے ہاتھ چوم لونگا ۔

اچھا ! ! آج سے تیری تنخواہ میں پانچ روپیہ کی ترقی "

"سلام صاحب "

رامو مسکرایا ۔ مگر فوراً ہی گھبرا کر بولا ـــــ "

"اور اگر صاحب کل ایسا ناشتہ نہ بنا تو ـــــ "

اور رامو کی اس حماقت پر شہلا کچھ گھبرا سی گئی ۔ اس نے جلدی سے رامو کو اپنی آنکھوں اپنے ہاتھوں اور گردن سے اشارہ کیا ۔ کہ وہ فکر نہ کرے کل بھی وہ اسی طرح آکر ناشتہ تیار کر دے گی ۔

"اچھا صاحب ـــــ " رامو خوش ہو کر بولا " کل بھی آپ کو اچھا ہی ناشتہ ملے گا صاحب "

"رامو ـــــ !

"جی صاحب ـــ "

جیون ادھر اُدھر نظریں گھما کر اپنی قوت شامہ سے کام لیتا ہوا بولا ۔

"یہ بھینی بھینی خوشبو کہاں سے آ رہی ہے ؟ "

اور جیون کے اس سوال پہ رامو گھبرا گیا مگر پھر فوراً ہی سنبھل کر بولا ۔

"معاف کیجئے گا صاحب ! وہ بات دراصل یہ ہے صاحب کہ میرے ایک دوست نے زبردستی میرے کپڑوں میں عطر کی شیشی انڈیل دی ۔ کہہ رہا تھا کہ یہ عطر کی شیشی اسے بڑی مہنگی مل گئی تھی صاحب ـــ "

اور رامو کی اس ذہانت پر شہلا کو عجیب خوشی ہوئی۔ وہ کہہ رہی تھی۔
"عطر کی شیشی پڑی ملی تھی۔ تمہارے دوست کو یا وہ کہیں سے چرالایا تھا"
جیون مسکرایا۔
"یہ تو ایشور جانے صاحب" رامو بولا "مگر ایک بات ہے صاحب دوست چور نہیں ہے"
"اچھا! اچھا!" جیون مسکرایا "وہ تو بھئی ہیں نے تفریحاً تمہارے دوست کو چور کہہ دیا تھا۔"
ایک کپ چائے ختم کر چکنے کے بعد جب جیون نے پیالہ میز پہ رکھا تو شہلا نے اشاروں سے رامو سے کہا کہ وہ اپنے صاحب سے پوچھے کہ انہیں اور چائے تو نہیں چاہئے اور رامو مسکرایا۔
"صاحب! ایک کپ چائے اور"
"بڑی مزیدار چائے ہے۔ آج کی" جیون بولا "تم تو جانتے ہی ہو کہ میں زیادہ چائے کا عادی نہیں ہوں۔ مگر خیر آج تم ایک کپ چائے اور دے سکتے ہو بڑا اچھا ذائقہ ہے آج کی چائے کا"
شہلا نے دوسرا کپ تیار کیا۔ اور کپ اس نے جیون کی طرف بڑھایا ہی تھا کہ آہٹ پاکر جیون نے بھی اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ اور شہلا کے ہاتھ سے جیون کا ہاتھ ٹکرانے ہی والا تھا کہ اس نے بڑی صفائی سے تیزی کے ساتھ اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ اور اسی طرح ایک وہ بات جو بگڑنے والی تھی بگڑتے بگڑتے بن گئی۔ جیون نے دوسرا کپ بھی بڑے مزے لے کر پیا۔

نیپکین —" جیون نے نیپکن کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ اور شہلا نے دل کی انتہائی گہرائیوں کے ساتھ بخوشی یہ کام بھی خود ہی انجام دے دیا۔

جیون۔ نیپکن سے اپنا منہ صاف کرتا رہا۔ اور شہلا اسے بڑے تقدس اور پیار بھرے انداز سے دیکھتی رہی۔ اور رامو ان دونوں کو دیکھ دیکھ کر دل ہی دل میں خوش ہوتا رہا۔

چائے پی کر اور ناشتہ کر کے جیون صوفہ پر آ کر بیٹھ گیا۔ اور میز پہ سے برتن سمیٹنے لگی۔ کہ رامو نے کانا پھوسی والے انداز میں اس سے کہا۔

"آپ رہنے دیجئے۔ یہ کام میں کر لوں گا"

"رہنے دو تم" وہ بڑے شوق بھرے لہجہ میں بولی "تم تو کرتے ہی ہو"

"اور آپ ناشتہ نہ کریں گی"

"میں ناشتہ کر کے آئی ہوں"

"پھر بھی کچھ —"

اور شہلا نے جیون کے آگے کے بچے ہوئے پراٹھے میں سے ایک ٹکڑا منہ میں ڈال کر ہاتھ کے اشارے سے بولی۔

"بس —!"

رامو خوش ہو گیا —

"رامو —! جیون نے آواز دی۔

"ذرا ہندوستان تو لگانا۔ اپنے دیش کی خبریں نہیں سنیں ابھی"

شہلا چونکی اور چونک کر خوش ہو گئی۔ اور پھر اس نے ریڈیو پہ دہلی کو کیچ کیا۔ وہاں سے خبریں ہو رہی تھیں۔ جیجو بڑے دھیان سے خبریں سننے لگا اور شہلا اس جگہ ریڈیو کے قریب کرسی پر بیٹھی رہی وہ بڑے اپنائیت بھرے انداز میں جیجو کو دیکھ رہی تھی۔

رات کے دو بج چکے تھے۔ اور نیند جیون کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ کئی بار سونے کی کوشش کر چکا۔ مگر اسے دماغ میں ماضی کی چیزیں اتنی بیتابی کے ساتھ کلبلا رہی تھیں کہ وہ اپنے دماغ کو ان یادوں کی یورش سے نجات نہ دلا سکا۔ اس کا ذہن بڑی تیزی کے ساتھ اس کے ماضی کے اوراق کو الٹ پلٹ رہا تھا۔

اس کے ماضی کی جو کتاب تھی۔ اس میں کئی ایک باب تو ایسے تھے جنہیں ہمیشہ کے لئے بھول جانا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا اس کی کوشش تھی کہ وہ اپنے ماضی کی اس کتاب سے ان بابوں کو نوچ ڈالے انہیں کہیں ضائع کر دے۔ انہیں کہیں ایسی جگہ لے جا کر وہ دفن کر دے کہ وہ پھر اسکے سامنے نہ آسکیں۔ اور ان کی یاد سے وہ اپنے ذہن کو یکدم سے نجات دلا دے۔ ان بابوں کو ایک ایک کر کے وہ چن ڈالنا چاہتا تھا۔ مگر کوئی اس کے بنائے نہیں بن سکتی تھی۔ اس کی اس قسم کی

ایک بھی کوشش اب تک بار آور نہ ہو سکی تھی۔

وہ حقیقی شدید کوشش سے ان یادوں کو بھلانا چاہتا تھا۔ وہ اتنی ہی شدت کے ساتھ ابھر ابھر کر ہمیشہ اسکے ذہن کو پریشان کرتے رہتے تھے۔

اور یہ کشمکش آج سے نہیں بلکہ پورے بارہ سال سے اسی طرح۔ اسی ایک انداز میں جارہی تھی۔

اس کی چھوٹی بہن بملا جسے ہمیشہ وہ پیار سے بمل کہا کرتا تھا۔ ونسنٹ کالج میں فرسٹ ایئر میں پڑھتی تھی۔ اور اسی کالج میں ایک طالبعلم اور تھا منوہر۔ وہ فورتھ ایئر میں تھا۔ اور منوہر اور اس کی چھوٹی بہن بملا میں بڑی گہری دوستی تھی۔ اور ان دونوں کی دوستی کی یہ بات اسے اچھی طرح معلوم تھی۔ اسلئے کہ منوہر کے بارے میں وہ اکثر بہن سے سن چکا تھا۔

بملا ہمیشہ منوہر کی تعریفیں کرتی تھی۔ اور اس کا ذکر وہ کچھ اس انداز میں کرتی تھی۔ کہ اس کے اس ذکر سے اسکے دل و دماغ کا اندازہ لگانا کچھ زیادہ مشکل نہیں تھا۔

اور سچ بات تو یہ تھی کہ اس کالج کی زندگی میں ایک سال رہ کر بملا اور منوہر سچ مچ کے ایک جان دو قالب ہو چکے تھے۔ وہ دونوں اسی کالج کے ہوسٹل میں رہتے تھے۔ وارڈ الگ الگ تھے تو کیا ہوا۔ وارڈوں کی علیحدگی ان کے دلوں کو تو علیحدہ کر نہیں سکتی۔

کوئی پروگرام ہو بغیر ایک دوسرے کے کبھی مکمل نہ ہوتا۔ پکنگ، پارٹی، سیر تفریح

سینما، تھیٹر سب ایک ساتھ — منوہر کبھی کبھی بملا سے کہتا۔

"بمل —!"

"کیا —؟"

"ایک بات ہے —"

اور بملا شوخی سے جواب دیتی —

"اس بات کے علاوہ اور کوئی دوسری بات نہیں ہے تمہارے پاس"

"نہیں بمل" وہ جذباتی بن جاتا۔

"بڑی اہم بات ہے یہ —"

"اور ہزار بار میں تمہاری یہ اہم بات سن چکی ہوں"

"کیا سن چکی ہو —؟"

"یہی کہ تم ایک غریب ہو — اور میں ایک بہت بڑے آدمی کی بیٹی ہوں"

اور پھر وہ منوہر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھتی —

"کیوں ہے نا یہی بات —؟"

"تم تو مذاق اڑا رہی ہو میرا — "

منوہر گھگھیانے والے انداز سے کہتا۔ اور بملا اور زیادہ تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے کہتی —

"مذاق بھی جیسے کوا یا کبوتر ہے — کہ میں اسے ہر وقت اڑایا کروں"

اور پھر وہ مسکرا دیتی — اور منوہر کو ڈانٹنے والے انداز میں کہتی —

"اور یہ تم نے مجھے کو آہی کب سے سمجھ لیا ہے"

منوہر کوئی جواب نہ دیکر خاموش ہو جاتا۔ اور پھر وہ دور خلاؤں
میں وہ اپنی نظریں گاڑ دیتا۔

"اے مسٹر ——! بملا شرارت سے کہتی۔

"مجھے یہ ہر دم اونگھنے والی فلسفی ایک آنکھ نہیں بھاتے۔ سمجھ لیجئے۔
جناب — ہاں ——!"

اور پھر جب اس پر بھی منوہر کوئی نوٹس نہ لیتا تو وہ اسے جھنجوڑ ڈالتی۔

اگر ایسا ہی شوق ہے جناب کو وجد کا تو کسی پہاڑ وہاڑ پر چلے جایئے
یہ دنیا مردی اس کام کے لئے قطعاً مناسب جگہ نہیں ہے۔ پلیپا بھنگ
ہو جائے گی یہاں آپ کی"

"کبھی سنجیدہ بھی بنا کرو بملا" منوہر سچ مچ چڑ جاتا۔

"یہ کس اونگھتی ہوئی چڑیا کا نام لیا آپ نے۔؟ بملا اُکتائی آ جانے
والے انداز میں کہتی ——

"جاکی طرح اس کمبخت سنجیدہ چڑیا سے بھی مجھے دلی نفرت ہے!"

وہ زمین پر تھوک کر کہتی۔

"چھی! ایشور نہ کرے کہ میں اس اونگھتی ہوئی چڑیا کا روپ دھار لوں۔
سب کچھ بننا منظور ہے مجھے۔ مگر سات جنم میں بھی میں یہ چڑیا بننا تمہاری
قسم منظور نہ کروں گی ——"

"تو تم ضرورت سے زیادہ شریر ہو"

"ہاں یہ بات اگر ہے تو ٹھیک" بملا مسکرائی "ضرورت سے زیادہ ہر چیز

بری ہوتی ہے۔ آج سے ہیں شرارت کے ساتھ ضرورت سے زیادہ نکال دونگی ۔"

"شریر کہیں کی ۔"

منوہر اسے گدگدانے لگا۔ اور بملا کھلکھلا کر ہنستی ہوئی بھاگتی۔ اور منوہر اسے پکڑنے کے لئے دور تک اس کے پیچھے بھاگتا جاتا۔

اور ایک وہ بات جسے منوہر سنجیدگی کے ساتھ بملا سے طے کرنا چاہتا تھا کبھی پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکی۔ بملا کی حد سے بڑھی ہوئی شرارت اور شوخی کی نذر ہو کر رہ جاتی۔

کالج میں ٹور کا ایک خاص پروگرام طے ہوا۔ فسٹ ایر سے لیکر فورتھ ائیر تک کے تمام آرٹسٹ کے اسٹوڈنٹ اس میں شریک تھے۔ سب سے پہلے لوگ آگرہ گئے۔ وہاں تاج محل کی سیر اور ریسرچ منظور تھی۔

بملا اور منوہر بھی اس پارٹی میں شریک تھے۔ اور انتی آزادی سے انکے دونوں ایک ساتھ رہنے کا یہ انہیں اچھا موقع نصیب ہوا تھا۔

انٹر کلاس کی پوری دو بوگیاں۔ کالج کے ان طالب علموں کے لئے ریزرو تھیں۔ پوری پارٹی آگئی تھی۔ سبھی اسٹیشن پر جمع تھے۔ ماسوا منوہر کے

وہ ابھی تک لاپتہ تھا۔ شیلا نے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی رسٹ واچ کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"ارے بملا سنتی ہو منوہر لاپتہ ہے"

"آتا ہی ہوگا۔"

"کیا آئے گا خاک" شیلا بملا کو چھیڑتے کے طور پر بولی۔

"گاڑی چھوٹنے میں تو صرف پانچ منٹ اور رہ گئے ہیں"

"پانچ منٹ —!"

"اور نہیں تو کیا پانچ گھنٹے" سلطانہ بولی۔ وہ دیکھو تو سامنے کتنی بڑی گھڑی لگی ہوئی ہے۔ اور وہ رہا ٹرین کا ڈیپارچر ٹائم۔ گاڑی ٹھیک پانچ بجکر اکیس منٹ پر چھوٹ جائے گی"

"اور نہیں تو کیا" شیلا بولی" اور اب بجے کیا ہیں" اس نے دوبارہ اپنی گھڑی دیکھی۔

"پانچ بجکر سترہ منٹ —"

"یعنی صرف چار منٹ رہ گئے ہیں۔ یعنی ایک منٹ اور کم ہو گیا" ایک دوسری لڑکی چہکی —

"اب کیا ہوگا —؟" شیلا نے ایک بات پوچھی —

"بملا کا سامان گاڑی سے اتروانا پڑیگا" خورشی بھی اب اس مذاق میں شریک ہو گئی تھی۔

"یہ کس لئے —؟" سلطانہ نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔

"تو بھی بس بدھو ہی رہی نری" شیلا نے سلطانہ کے دو ہتڑ رسید کئے۔

"منوہر کے بغیر بملا کہیں جا سکتی ہے۔ بیچاری!"

"تم اپنی فکر کرو بڑی بی" بملا نے شیلا کی کمر پہ چوٹ کی۔

"میرا کیا ہے نہ سہی منوہر۔ کوئی اور کاٹھ کا الو پھنس جائے گا اپنے جال میں۔"

"سچ مچ بملا کے جال کے دھاگے تو ابھی کافی مضبوط ہیں" سلطانہ کو بڑے زور کی ہنسی آگئی۔

"البتہ شیلا تمہارا جال کافی پرانا ہو چکا ہے"

"اور خستہ بھی" بملا مسکرائی۔

"اور اب تک ایک شکار بھی نہ پھانس سکی بیچاری" ششی نے شیلا سے اظہار ہمدردی کی۔

"مجھے بڑی ہمدردی ہے بہن"

وہ شیلا کی پیٹھ تھپکنے لگی۔

"اچھا ــ! اب مجھ پہ بھی پھبتے اڑانے لگی" شیلا جھینپ کر بولی۔ اور اس نے ششی کے ہونٹ مل ڈالے "پہلے اپنی تو خبر لے۔"

"یہی مشورہ حضور اگر پہلے آپ کو دے لیتیں تو کتنا اچھا ہوتا" بملا نے اظہار تاسف کیا۔

"تو ہم اپنی شیلا کو عقلمند نہ سمجھنے لگتے" سلطانہ چک چک کرتے ہوئے شیلا کی پیٹھ تھپکنے لگی۔

"شیلا بیچاری ـــــ!"

"کون بیچارہ ——— ؟" منوہر نے بیچارگی کھڑکی میں جھانک کر بولا۔ کہ اتنے میں گاڑی چھوٹ گئی۔ اور وہ لپک کر ڈبے کے اندر گھسنے لگا۔

"ابے او منوہر کے بچے" جگموہن نے اس کی ٹانگ پکڑ لی۔

"اتر اس ڈبے سے نیچے"

"ارے بھئی رحم بھی کرو اس غریب پر" حامد چیخا۔

"شمع تو یہاں جل رہی ہے۔ اور تم پروانے کو کہیں اور لیجانا چاہتے ہو۔ لپک کر منوہر ڈبہ میں گھس گیا اور اس کے پیچھے یہ دونوں بھی ڈبہ میں داخل ہو گئے۔

"ارے مسٹرو ——! سلطانہ چیخی۔

"یہاں لیڈیز بیٹھی ہیں اور تم لوگ آنکھ بند کئے ہوئے یہاں گھس آئے"

وہ مصنوعی غصے سے ان لوگوں کو گھور رہی تھی۔

"تو آپ برقعہ اوڑھ لیجئے" منوہر نے سلطانہ کے دھپ رسید کی۔

"برقعہ تو عقل کو اوڑھا رکھا ہے۔ اس بیچاری نے آپ خود کیا اوڑھیگی خاک" بیلا ہنسی۔

"اور تو نے تو جیسے زمانہ بھر کی عقلمندی کا ٹھیکہ ہی لے رکھا ہے" سلطانہ نے بملا کے زور سے چٹکی لی۔

حامد بولا۔

"اور کسی کی عقل نہ سہی۔ مگر کم از کم منوہر کی عقل کا ٹھیکہ تو بملا ہی کے پاس ہے بھئی"

وہ مسکرایا۔

اور جیسے تو اس بیچارے کو بملا کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔"

"اور آپ کو اس بات کا غم کھائے کھلئے جا رہا ہے۔ لاکھ کوشش کے باوجود میں نے آپ کے تمغل کے ٹھیکے سے انکار کیوں کر دیا۔"

بملا بولی۔

"ہے یہی بات۔"

حامد کچھ جھینپ سا گیا۔ اور پورے ڈبہ کی لڑکیوں کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا۔

"میں نے آپ کے حضور میں کب درخواست گذاری تھی حضور۔"

حامد نے بملا سے سوال کیا۔

"گذر ہو جب نہ!" ششی چہکی۔ "سوال تو گذر کا ہے نہ کہ گذارنے کا۔"

اور اس پر ہنسی کا وہ دور اٹھا کہ خدا کی پناہ سب کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا۔ اور خود حامد بھی سب کے ساتھ ایک ہنسی میں شریک تھا۔

"آپ کے حضور میں اگر یہ خاکسار درخواست گذارے تو؟" جگموہن نے بھکاریوں جیسی صورت بنا کر ششی سے سوال کیا۔

"تو میں آپ کی درخواست پر کم از کم سات جنم تک سوچوں۔"

"کیا کہا سات جنم۔" شیلا بولی ہی تھی۔ کہ بملا نے اس کی بات اچکی۔

"اور آپ کو غالباً اسی جنم میں ایسی ایسی سات درخواستیں یکساتھ قبول فرما لیں۔" بملا نے سنجیدگی سے سوال کیا۔

"کیوں ہے نہ یہی بات۔"

ہنسی کا اتنا طوفان اٹھا کہ گاڑی کا شور اس ہنگامے میں ڈوب گیا اور نہ جو لگا

تو بارے ہنسی کے اتنا برا حال ہوا کہ انہیں کھانسی آنے لگی ہنستے ہنستے۔
شیلا بھی سب کے ساتھ مل کر کھسیانی ہنسی ہنس رہی تھی۔

گاڑی ایک اسٹیشن پہ رکی تو منوہر حامد اور جگموہن ڈبے سے باہر آ گئے۔ اور ساتھ ہی چند لڑکیاں بھی۔ ایک مولوی صاحب قسم کے بزرگ اپنا بستر کسی سے باندھے ہوئے اسے بغل میں دبائے بھاگم بھاگ جگہ کی تلاش میں بڑھے چلے جا رہے تھے۔ کہ وہ اس ڈبہ کے قریب آ کر ذرا سا ٹھٹکے۔ اور پھر اس جگہ پریوں کا جھرمٹ دیکھ کر رک گئے۔

"کہوں کیا خیال ہے قبلہ" حامد نے آگے بڑھ کر ان سے سوال کیا۔ اور وہ لڑکیوں کو کھا جانے والے انداز کی حد تک گھورنے سے چونک کر قدرے ترش روئی سے بولے۔
"آپ اپنا کام کیجیے صاحب"
"غلطی ہوئی قبلہ معاف فرمایئے گا"
حامد انکساری سے گویا ان سے سہم کر بولا۔ اور وہ پھر بدستور ڈبے کا جائزہ لینے میں معروف ہو گئے۔
"سب لڑکیاں ہیں مولانا۔ جگموہن نے نزدیک آ کر انہیں بتایا۔ یعنی کہ یہ جنس لطیف"
"آجایئے ۔ آجایئے۔ تشریف لایئے صاحب" کئی لڑکیوں نے یک وقت ہاتھ کے اشارے سے انہیں اندر بلایا۔

اور مولانا کی باچھیں کھل گئیں۔ جبڑا کافی سے زیادہ پھیل گیا اور وہ مسکراتے ہوئے ڈبہ کے اندر قدم رنجہ فرمانے ہی والے تھے کہ یکبارگی اپنا داہنا قدم بڑھا کر رک گئے۔

"استغفر اللہ! یعنی یہ کہ ڈیوڑھا ہے"

"جی ہاں مولانا" سلطان نے اندر سے آواز لگا۔

"مگر ایک ٹکٹ میں کئی مزے بھی تو ہیں"

اور قبل اسکے کہ مولانا سنبھل کر پیچھے ہٹیں۔ منوہر نے پیچھے سے انہیں گود میں بھر کر دھکا دیدیا۔ اور ادھر اندر سے کئی لڑکیوں نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا

"آیئے۔ آیئے۔ مولانا زہے نصیب قدم رنجہ فرمایئے"

لڑکیاں انہیں پکڑے ہوئے تھیں کہ وہ یکبارگی تڑپ کر سب کی گرفت سے آزاد ہو کر نیچے پلیٹ فارم پر چاروں خانے چت گرے دھڑام سے۔

"ارے! ارے!!" کئی لڑکیوں نے انہیں بڑھ کر اٹھایا۔

"بہت بدتمیز ہیں آپ لوگ" مولانا قہر آلود نظروں سے سب کو گھورتے ہوئے بولے۔

"سر بازار مذاق کرتے ہوئے شرم نہیں آتی تم لوگوں کو"

"سر بازار نہیں مولانا" کملا نے اصلاح کی "برسر پلیٹ فارم کہیئے۔ برسر پلیٹ فارم۔

تمہارا سر" مولانا برا سا منہ بنا کر بھاگے اور ادھر انجن نے وسل کیا۔ گاڑی رینگ رہی تھی کہ ایک بھائی جی ہانپتے ہوئے آئے اور زبردستی کا لیح

کی شرطاق ٹولی نے انہیں اپنے ڈبہ میں اچک لیا۔ کیا کرتے بیچارے۔ کالج کے ان چھوکروں میں پھنس چکے تھے۔ پھڑ پھڑا کر رہ گئے۔

"رام رام رام —" وہ ڈبہ میں پہنچکر اطمینان سے بڑبڑ — "اور ما کلجگ ہے کلجگ — گھور کلجگ —"

"گھور نہیں —" سلطانہ نے اصلاح کی "گھٹا گھنگور"

"وہ ڈبہ کی پشت سے لگے بدستور کھڑے تھے۔ کہ انہیں ہملا نے سیٹ آفر کی

"پدھاریئے مہاشے۔ بڑا اسکی وائی آنند پراپت ہوگا"

"گھور پاپ بڑھ گئے ہیں۔ دھرتی پر" وہ غصے سے ناک بھوں سکیڑتے ہوئے ان لڑکوں اور لڑکیوں کو کھا جانے والی نظروں سے گھور کر بڑبڑائے۔

"سچ ہے مہاشے" حامد بولا "جبھی تو آکاش سے ورشا نہیں ہوتی۔ کال پڑ رہے ہیں چاروں اور"

"مہاشے —!" جگموہن نے عقیدتاً بڑھ کر ان کا ہاتھ چوما " بڑے ودوان جان پڑتے ہیں۔

"وِدوان —!" آگے بڑھ کر ہملا نے ان کی تونڈ مبارک پر ہاتھ پھیرا۔

"مہاودوان" ساری کی ساری بدھی اور ودیا یہیں تو بھری ہے مہاشے کے"

کھیس نکال کر اپنے بتیس دانتوں کی نمائش فرماتے ہوئے بولے۔

ودیا تو پرکھوں سے چلی آ رہی ہے۔ اپنے کٹم میں۔

"کیوں نہیں، کیوں نہیں" کئی لڑکوں اور لڑکیوں نے انہیں زبردستی

اپنے پاس بٹھایا۔

"مہاشے ۔۔۔" جگموہن نے کہا "ذرا دیکھئے تو ہماری ریکھا میں کیا لکھا ہوا ہے؟"

"پرشوں کی ریکھائیں نہیں ریکھائیں تو استری جاتی کی دیکھی جاتی ہیں۔"

انہوں نے جگموہن کا ہاتھ ایک طرف کو ہٹاتے ہوئے بیٹھی ہوئی لڑکیوں کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا ۔

"تو ہمارا ہاتھ دیکھئے ۔ ہماری "ریکھا" ہی پڑھئے ۔۔"

بیک وقت کئی مہاشے کی طرف بڑھے ۔

اور وہ بیک وقت کئی ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں کی انگلیوں سے رگڑتے ہوئے بولے ۔

"تم سب کی ریکھائیں ایک پرکار کے بھوش کا پتہ دیتی ہیں" وہ لڑکیوں پر جھکے جا رہے تھے ۔

"بڑے رنگین مزاج ہیں یہ مہاشے" جگموہن نے آہستہ سے کہا ۔

"اگر بس چلے اس کا تو ان سب کو ایک ساتھ گھول کر پی جائے" مینو ہنس پڑا ۔

"ذرا انہماک تو دیکھئے مہاشے جی کا" حامد نے جگموہن کو ایک ٹھوکا دیا ۔

"ابھی خبر لیتا ہوں" جگموہن نے چپکے سے کہا ۔

"تم بڑی بھاگ شالی ہو" وہ سلطانہ کا ہاتھ دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولے ۔

"اور میں نہیں ۔۔۔" بملا بولی ۔

"کلیان ہوگا تمہارا ۔۔۔" وہ بملا کو تقریباً زندہ نگل لینے والی نظروں سے گھور رہے تھے

"پرنتو ا سندیہہ ہے ایک بات کا۔"

"کس بات کا سندیہہ ہے مہاشے" ببلا گویا آزاد عذاب الٰہی سے خوف کھاتے ہوئے بولی۔

"تمہارے بھوت کال میں راہو کا کلش ہے" بلا کو چاکلیٹ سمجھ کر اپنی زبان چاٹتے ہوئے بولے۔

"پرنتو تم پر منگل و شنادر پر ببیت بھگنی کا اثر ہے۔ اور اس سے تمہیں کس پرکار کی چنتا پرگٹ کرنے کی بالکل آوشکتا نہ ہونی چاہیئے۔

"اور میری ریکھائیں مہاشے" شیلا بڑے اشتیاق سے بولی۔

"تمہاری ریکھاؤں میں انیک پرکار کے ستارے اشرام کر رہے ہیں"

"اور میری ریکھائیں ؟" ششی نے بے چینی سے سوال کیا۔

"شنی وو ش اور راہو سمبنتی کا کلش تم پر سایہ کئے ہوئے ہے"

"اور آپ پر کون سا کلش سایہ کئے ہوئے ہے مہا جوتشی مہاراج" جگموہن نے مہاشے جی سے سوال کیا۔

"آپ پر ڈبلیو۔ ٹی ہونے کا سندیہہ ہے جگموہن" حامد نے مہاشے جی کو تمسخر سے دیکھا۔

"یہ ڈبلیو۔ ٹی کیا ہوتا ہے جی" مہاشے نے گویا حامد کے علم نجوم کا مذاق اڑایا۔ اور وہ سچ مچ وہ ان دونوں کی دخل در معقولات سے چڑ گئے تھے۔ ان دونوں کی موجودگی میں انہیں اپنے لئے گویا کباب میں ہڈی معلوم ہوئی۔

"یہ ڈبلیو ٹی کیا ہوتا ہے کا جواب آپ ان سے لیجئے مہاراج"

منوہر نے مہاشہ جی کی توجہ ایک ٹی ٹی ۔ سی کی طرف مبذول کرائی ۔ جو عین ان کے پیچھے کھڑا انہیں مسکرا مسکرا کر دیکھ رہا تھا ۔ اور اسے دیکھ کر مہاشے جی بولے ۔

"ہاتھ دیکھنے کی فیس پڑتی ہے مسٹر"

اور یہ کہکر وہ پھر ان لڑکیوں کی طرف متوجہ ہوئے ۔ کہ یکبارگی انہیں کچھ خیال آیا ۔ اور انہوں نے گھوم کر گھبرائے ہوئے لہجہ میں ٹی ٹی سی کی طرف متوجہ تھا

"شما کیجیے صاحب" وہ گڑبڑا کر کھڑے ہو گئے ۔

"ان لوگوں نے زبردستی ہمیں اس ڈبہ میں کھینچ لیا تھا"

مہاشے کے چہرے کا علم نجوم کی کٹھن تپسیا کی جگہ خوف و ہراس کے آثار پیدا ہو گئے

"کہاں سے آ رہے ہو تم"

"جی میں —— ؟

جی ہاں ۔ میں آپ ہی سے یہ پرشن پوچھنا چاہتا ہوں سمجھا گیا پراپت کر رہا ہوں"

اور ٹی ۔ سی کی اس زندہ دلی پر سب قہقہہ مار کر ہنس دیئے ۔ اور مہاشے جی پر گویا لرزہ طاری ہو گیا ۔ ہکلا ہکلا کر تھوک نگلتے ہوئے بولے ۔

"بن کا پنچھی ہوں ۔ سرکار ۔ آج یہاں ۔ کل وہاں ۔ کبھی ادھر کبھی ادھر"

"ابھی کہاں سے آ رہے ہو ۔ ؟"

"پچھلے اسٹیشن سے" جیسے کہ وہ اس نامعقول سوال پر خفا ہو گئے ۔

"کہاں جاؤ گے"

"جہاں من کی موج لے جائے"

ٹی۔ٹی سی مسکرایا۔ "ٹکٹ ہے تمہارے پاس"

وہ کھسیانی ہنسی ہنسے۔ "ٹکٹ نہیں ہے وہ دیا ہمارے پاس"

"اچھا وہ دیا سا گرہ صاحب" ٹی ٹی سی نے اپنی جیب سے رسید بک نکالی۔

"نکالئے چودہ روپے بارہ آنے"

"ہمرے پاس تو وہ دیا آنچیر واد وہی چیزیں ہیں"

"اور تیسری چیز۔ ؟ چودہ روپے بارہ آنے" جھگو میں مسکرایا۔

"وہ نہیں ہمارے پاس"

"تو پھر آپ ہمارے ساتھ چلئے" ٹی ٹی سی نے رسید بک واپس جیب میں رکھ لی اور ادھر موقعہ غنیمت جان کر مہاشے جی نے چلتی گاڑی سے چھلانگ لگانے کی کوشش کی۔ اور لپک کر ٹی سی نے انہیں پیچھے سے پکڑتے ہوئے کہا۔

"اس کھڑکی سے نہیں جوتشی مہاراج۔ اس دروازے سے چلئے ہمارے ساتھ"

گاڑی ایک پلیٹ فارم پہ رک چکی تھی۔ اور جوتشی مہاراج ایک حسرت بھری نگاہ ان لڑکیوں پر ڈالتے ہوئے رخصت ہوئے۔

اور ادھر سے کملا نے آواز لگائی۔

"مہاراج آپ کے لکشن میں شنی اور منگل وشرام کر رہے ہیں۔

آگرہ سے تاج محل کے علاوہ اور دوسری تاریخی عمارتیں دیکھ یہ پارٹی بھوپال گئی۔ اور پھر دو چار گھنٹے وہاں گھوم کر یہ لوگ سانچی کے لئے روانہ ہو گئے

بھوپال کے پاس سانچی ایک تاریخی جگہ ہے۔ یہ جگہ مہاتما بدھ کے استوپا کے لئے مشہور ہے۔ بڑی قابل دید چیزیں ہیں۔ بدھ مذہب کی اتنی عظیم الشان تاریخی یادگار ہندوستان میں کہیں اور نہیں ہے۔

اور یہاں پہنچکر یہ لوگ ایک رات کے لئے وہاں ڈاک بنگلہ میں رکے بھی۔

بڑی خوشگوار شام تھی یہ۔ اور منوہر اور پرمیلا کی ایک چھوٹی سی پہاڑی پر ایک پر فضا جگہ ایک دوسرے کے قریب بیٹھے ہوئے تھے۔ دوسرے ساتھیوں اپنے پروفیسر کی نظروں سے بچکر وہ یہاں تک آئے تھے۔

سامنے دور دور تک گندم کے کھیت لہلا رہے تھے۔ گندم پک گئی تھی اس لئے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے ملوں کسی نے سونا پگھلا کر پھیلا دیا ہو۔ پیال

سونے کا ایک سمندر تھا۔ جو ہیلوں نک بل کھاتا اور مچلتا ہوا چلا گیا تھا۔ ہوا کی ایک خفیف سی جنبش کھیتوں کے حسن میں چار چاند لگا دیتی۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے کہ سونے کا سمندر لہرا رہا ہو اور بل کھا رہا ہو۔

کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر سارس کے جوڑے اپنی گردنیں بلند کئے ہوئے کھڑے قلیں قلیں کر رہے تھے۔ دور سے ان کی گردنوں کا شوخ سرخ رنگ ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ کہ جیسے لالے کے پھول کھلے ہوئے ہوں۔ پہاڑیوں پر ادھر ادھر مور ٹہل رہے تھے۔ اور ان کے پیروں کے رنگ آمیزی انسان کو بات پر مجبور کر رہی تھی۔ کہ وہ قدرت کی غیر فانی عظمت کے آگے اپنا سر جھکا دے۔

اور کھیتوں میں کہیں کہیں جہاں کی گندم کٹ چکی تھی ہرنوں کے جھنڈ کھڑے تھے۔ ہرن چوکڑی بھرتے تھے اور ہرنیاں بڑے پیار سے اپنی گردنیں اٹھائے ان کلیل کرتے ہوئے ہرنوں کو دیکھ رہی تھی۔

بعض بچے اپنی ماں کے تھنوں سے لگے ہوئے دودھ پی رہے تھے۔ کھیتوں کی پگڈنڈیوں اور دو گیاروں پر سے چرواہے بنسریاں بجاتے اور اپنے اپنے سروں پر چھوٹی چھوٹی لکڑیوں کے گٹھے اور ہریالیاں لئے کتنی سرخ اور سبز نیلے رنگ کے لہنگوں میں ملبوس خراماں چلی جا رہی تھی۔

طوطاں اور کوؤں کے غول مشرق سے مغرب کی طرف بڑی تیزی کے ساتھ پرواز کرتے ہوئے گزر رہے تھے۔

اتنا دلکش سماں تھا کہ امنگیں بیدار ہو جائیں۔ جوانیاں مچل پڑیں اور ارمانوں میں آگ مچلنے لگے۔ اور نو اور مرجھائی ہوئی جوانیوں کے لئے بھی

یہ مناظر کچھ کم خطرناک نہ تھے۔

پھر ان جوانیوں کا پوچھنا ہی کیا۔ جو ہنگاموں سے دوچار ہوں۔ جو جوان ہوں اور جنکی نظروں میں سادہ پانی بھی مے گلگوں بنکر رقص کرنے لگتا ہو۔

منوہر اور کملا دونوں کیف بار مناظر کی حشر آفرینیوں میں گم تھے۔ کہ یکبارگی منوہر نے کملا سے مخاطب ہو کہ کہا۔

"کمل ——!"

اور نہ جانے وہ کونسا جادو تھا یا مقناطیسی طاقت تھی کہ جس کے زیر اثر شوخ و شنگ کملا بھی اسوقت منوہر کی کچھ کہتی ہوئی آنکھوں سے شرما گئی۔ اور اس نے اپنی گردن نیچے جھکا لی۔

تھوڑی دیر بعد منوہر کملا کو اسی عالم میں دیکھتا رہا۔ اور پھر اس نے جذبات سے بے قابو ہو کر کملا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"ایک بات کہوں کمل ——" وہ کمل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

"کہیے ——!"

"کملا اسوقت اپنی ساری شوخی و شرارتیں ساری بھول گئی تھی۔ اسوقت اس کے وجود میں مشرقیت سما گئی تھی۔ اور منوہر سے کچھ جھینپ سی رہی تھی۔

"تم مجھے بھول تو نہ جاؤ گی ——"

اور کچھ لمحہ ساکت رہ کر کملا آہستہ سے بولی۔

"جی نہیں ——"

"ہمارے درمیان ایک دیوار حائل ہے کمل ——"

"دیواریں محبتوں کے درمیان حائل نہیں رہ سکتیں۔" بملا اب ہوش میں آچکی تھی۔ وہ بڑے اطمینان سے بولی۔

"بشرطیکہ وہ محبت پائدار ہو۔ اور سچی ہو۔"

"مگر۔۔۔"

بملا نے منوہر کی بات کاٹی۔

"میں نے آج تک آپ سے یہ بات نہیں پوچھی کہ آپ کون ہیں اور کیا ہیں" اس نے منوہر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

"اور آپ بھی نہ سوچیے کہ میں کون ہوں۔ اور کیا ہوں۔ ہمیں صرف اتنی ہی بات جاننے کی ضرورت ہے کہ ہم، ہم ہیں اور ہم وہ ہیں جو ایک دوسرے کو اپنا سمجھتے ہیں۔ کیا ضرورت اس بات کی کہ ہم ایک دوسرے کا حسب نسب پوچھیں ایک دوسرے کی مالی حالت کا جائزہ لیں۔ اور اس بات کے سوچنے میں اپنا سر کھپائیں کہ ہم کون ہیں۔ اور ہمارے ماں باپ کیا ہیں۔ ہم کہاں رہتے ہیں اور کیا کرتے ہیں۔ میں نے آج تک تمہیں یہ بات نہیں بتائی کہ میں کس کی بیٹی ہوں کس جگہ کی رہنے والی ہوں۔ اور میری گھریلو زندگی کیا ہے۔ اور میں نے تم سے بھی کبھی اس قسم کے سوالات نہیں لئے۔ اور اگر دو ایک بار تم نے خود سے اپنے خاندانی حالات کا ذکر کرنا چاہا تو میں نے روک دیا ہے تمہیں یہ کہہ کر ٹال دی ہے کہ مجھے ان ہنگاموں سے کیا حاصل۔ میں تو یہ جانتی ہوں کہ ہم انسان ہیں۔ اور ایک دوسرے کو پسند کر چکے ہیں۔ یہی بہت کافی ہے ہمارے لئے۔"

اور منوہر بملا کی اس گفتگو سے جیسے چونک پڑا ہو۔ وہ یکبارگی بملا کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر بولا۔

"بہت بڑا آدرش ہے تمہارا۔ بڑی آئیڈیلسٹک بات کی ہے تم نے اس وقت"

اور پھر وہ مکمل سنجیدگی اور خود اعتمادی کے ساتھ بولا۔

"آج ہم سے کبھی ایک دوسرے کے علاوہ کسی اور بات کی جاننے کی کبھی کوشش نہ کریں گے اور آج اس بات کے لئے میں بھی تمہیں وچن دیتا ہوں۔ وعدہ کرتا ہوں تم سے۔"

"اچھا آؤ اب ہم واپس چلیں۔" بملا اٹھتے ہوئے بولی۔ شام گہری ہو چکی ہے اور وہ لوگ ہمارا انتظار کر رہے ہوں۔"

"چلو۔"

منوہر اٹھ کھڑا ہو گیا اور وہ دونوں ایک ساتھ پہاڑی پر سے نیچے اترنے لگے۔ سامنے نیا چاند مسکرانے لگا تھا۔ اور اس کے پاس ہی چمکنے والے ستارے کی روشنی میں چمک آ گئی تھی۔

وہ دونوں ایک ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے اپنی منزل کی طرف بڑھے چلے جا رہے تھے۔

دور کہیں سے گجر نے تین بجائے ۔ اور جیون کے خیالات کا سلسلہ گجر کی اس آواز کے ساتھ ٹوٹ گیا ۔ وہ بے چین ہو کر اپنی مسہری پر سے اٹھ بیٹھا ۔ پیاس اسے بڑی شدت کے ساتھ لگ رہی تھی ۔ اس نے سوچا کہ رات کے تین بج چکے ہیں اور اسوقت اتنی رات گئے راموں کو محض اتنے سے کام کیلئے سوتے سے جگانا سراسر ظلم ہے زیادتی ہے ۔ یہ سوچکر وہ خود اٹھا اس نے سوچا کمرے کے باہر میز پر تھرموس رکھا ہوگا ۔ وہ خود ہی کیوں نہ جاکر پانی پی لے ۔

وہ ٹٹولتا ہوا اٹھا ۔ اور بڑی احتیاط سے دھیرے دھیرے اپنے کمرے سے باہر آگیا ۔ اسے اس بات کا اندازہ تھا ۔ کہ میز کس جگہ ہے ۔ وہ آہستہ آہستہ ٹٹول ٹٹول کر میز کی طرف بڑھ رہا تھا ۔ کہ وہ ناگاہ وہ کسی چیز سے ٹکرا گیا ۔ راموں کی غلطی سے ایک کرسی بڑے غلط طریقہ سے بیچ میں رکھی رہ گئی تھی ۔ اور وہ اس سے ٹکرا کر اوندھے منہ کرسی پر گر گیا ۔ کرسی پھسل کر الٹ گئی اور اس گر پڑا اسٹ میں وہ چوٹ کھا گیا ۔ اسکی کہنی کرسی کے ڈنڈے سے رگڑ کھا

کر چھل گئی ۔ اور اوندھے منہ گرنے کی وجہ سے پیشانی پر بھی چوٹ آئی اور نیچے کا ہونٹ قدرے زخمی ہو گیا ۔

" کیا زندگی ہے یہ ـــــ !

بڑی بے بسی کے عالم میں یہ جملہ غیر ارادی طور پر اس کے منہ سے نکل گیا ۔ اور وہ خود اپنی اس موجودہ زندگی پر کھسیانی قسم کی تکلیف دہ مسکراہٹ کے ساتھ جو شدید تلخ تھی ۔ اور بالکل زہر میں بجھی ہوئی تھی ۔ لڑکھڑاتا ہوا اٹھنے کی کوشش کرنے لگا ۔

زندگی بجائے خود قدرت کا ایک بہت بڑا عطیہ ہے ۔ مگر قدرت کا بخشا ہوا یہ عطیہ اس وقت ایک بہت بڑا عذاب معلوم ہونے لگتا ہے ۔ جبکہ اسے سنبھالنے کی صلاحیتوں سے انسان خود کو عاجز سمجھنے لگے ۔

اور یہی کیفیت اسوقت جیون کی تھی ۔ وہ زندگی کو خدا کا دیا ہوا سب سے بڑا انعام سمجھتا تھا ۔ اور یہی وجہ تھی ۔ کہ حادثات زمانہ کے ہاتھوں اتنا دل شکستہ اور مجبور ہو جانے پر بھی اس نے کبھی اس امر کی کوشش نہیں کی تھی کہ وہ خدا کے اس سب سے بڑے عطیہ کو ہائے ۔ اور حقارت سے ٹھکرا کر خودکشی کر لے مگر اپنی اسوقت کی لاچاری پہ وہ رو سا دیا تھا ۔ اس کا دل کڑھنے لگا ۔ اور وہ زندگی کی ان راہوں پر جھنجھلا گیا ۔

اور آج زندگی میں پہلی بار اس کے دل میں یہ خیال آیا کہ ایسی زندگی سے تو موت ہزار درجہ بہتر ہے ۔ وہ حساس تھا ۔ اور ہر احساس انسان کبھی نہ کبھی اس قسم کی باتوں کو سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے ۔ خواہ یہ باتیں کتنی ہی بودی اور پوچ

کیوں نہ ہوں۔

وہ اٹھا اور اٹھ کر بغیر اپنی پیاس بجھائے ہوئے واپس اپنے کمرے میں ہی آگیا۔ وہ اپنی مسہری پر اطمینان سے لیٹا نہیں۔ بلکہ یونہی تکیہ کے سہارے نیم دراز ہو گیا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ وہ آنکھیں جن سے وہ دیکھ سکتا تھا۔ مگر وہ اپنے ذہن کی روشنی میں اب سے بہت پہلے کے گزرے ہوئے ان حادثات کو بڑے روشن طریقہ سے دیکھ رہا تھا۔ جو اس کی زندگی کا ناسور تھے۔ اور جنہیں یکدم بھلانے کی کوششوں کے باوجود انہیں اب تک نہ بھول سکا تھا جیون کو یاد آیا ۔۔۔ اس نے زندگی میں ایک بہت بڑی ٹھوکر کھائی تھی۔ ایک ایسی ٹھوکر جس کی کسک سے وہ آج بھی بے چین ہے ۔۔ ۔۔۔

رات کے نو بج چکے تھے۔ اور جیون اور کمرے میں پیانو پلے کر رہا تھا کہ ایک نوکر نے آکر کہا۔

"چھوٹے سرکار آپ کو بڑے سرکار نیچے بلا رہے ہیں۔"

"کیا بڑے سرکار پنچایت سے آگئے!"

"جی ۔۔۔!"

"اچھا! ان سے کہو کہ ہم ابھی آرہے ہیں۔"

نوکر کے چلے جانے کے بعد جیون نے پیانو بند کیا۔ شب خوابی کا لباس پہنا۔ جلدی جلدی سیڑھیاں اتر کر وہ نیچے بڑے حال میں آیا۔ سامنے ہملا کھڑی تھی۔ اس نے پوچھا ۔۔۔

"پاپا کہاں ہیں مل"

"اپنے کمرے میں بھیّا"

اور وہ رائے بہادر کے کمرے میں پہنچا -

"نمستے پاپا"

"جیتے رہو"

"آپ نے مجھے بلایا تھا"

"ہاں جیون -" رائے بہادر صاحب بولے۔

"دیکھو جیون بات دراصل یہ ہے۔ کہ میں چاہتا ہوں کہ تم تھوڑا بہت زمینداری کا کام کاج سیکھ لو"

"بڑی خوشی سے پاپا۔ مجھے کب انکار ہے -"

"ہاں! اور پھر آجکل تمہیں فرصت بھی ہے۔ چھٹیاں ہیں نہ ابھی تمہاری؟"

"جی ہاں -!"

"میں سوچتا ہوں۔ میرا کیا۔ آج مر گیا تو کل دوسرا دن۔ اور پھر میرے بعد تمہیں ہی تو دیکھ بھال کرنی ہے۔ میں کہاں بیٹھا رہونگا سدا۔ یہ کام بھی سمجھ لو تو اچھا ہے۔

"بہت اچھا پاپا ــــ جیسا آپ کا حکم"

"بیٹھ جاؤ۔" رائے صاحب نے جیون کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور وہ بیٹھ گیا۔

"تو فرمایئے کیا حکم ہے میرے لئے -"

"تم دینا پور چلے جاؤ۔ صبح دو کارندے تمہارے ساتھ کر دوں گا۔ اس

فصل کا لگان تم وصول کر لاؤ۔"

"جی ہاں"۔

"اور ہاں" رائے بہادر صاحب بولے۔

"وہاں شکار بھی بہت ہے۔ آس پاس کے گاؤں میں تو شکار بھرا پڑا ہے"

"شکار کا تو بہت دنوں سے میرا بھی جی چاہ رہا تھا" جیون خوش ہو کر بولا۔

"کیا ہے کا شکار ہے پاپا وہاں"

"وہ سبھی جانور ملتے ہیں۔ ہرن چیتل سانبھر نیل۔ خرگوش اور پرندے ہر ایک قسم کے"

"تو میں ضرور جاؤں گا"

"تمہارے جانے کا بندوبست میں کر آیا ہوں"

"صبح کتنے بجے جانا ہوگا"

جیپ تو ہے ہی تمہارے پاس۔ اگر صبح پانچ بجے بھی نکل جاؤ گے تو کاشتکار تمہیں گاؤں ہی میں مل جائیں گے۔ ایک دن بیچ جائے گا تمہارا۔ نہیں تو پھر وہ لوگ کام پر نکل جائیں گے۔

کتنے بجے تک پہنچنا چاہئے ہمیں"

"پانچ بجے یہاں سے نکلو گے۔ تو پھر ساڑھے چھ بجے مزے میں پہنچ جاؤ گے۔

دیناپور کچھ زیادہ دور تو ہے نہیں"

"کتنے میل ہوگا یہاں سے؟"

"یہی کوئی تیس میل یا بتیس میل"

"کتنے دن کا وہاں کام ہو گا پاپا؟"

"زیادہ سے زیادہ دو دن کا" رائے بہادر صاحب بولے۔

"ویسے تمہاری مرضی۔ شکار میں جی لگے تو ہفتہ عشرہ رک جانا"

"بڑا اچھا پروگرام بنایا پاپا۔ بڑا مزا آئے گا"

"ہاں—!" رائے بہادر صاحب نے ایک سرد آہ بھری۔

"کبھی ہمارا زمانہ بھی تھا بیٹے۔ ہم بھی شکار پر جان دیتے تھے"

"تو اب کیا ہوا پاپا" جیون نے ضد کے انداز میں کہا۔

"آپ بھی چلیے نا—"

"وہ بات گئی بیٹا—" وہ دکھ بھرے لہجے میں بولے—

"سب کچھ چلا گیا تمہاری ماتا جی کے ساتھ"

"پاپا—!" جیون بیتابانہ بولا—

"کیسی باتیں کرتے ہیں آپ چھوڑیئے ان باتوں کو وہ تو ہو گیا جو ہونا تھا"

"مگر نہیں بیٹے" رائے بہادر نے بات بدلی۔

"یہاں مجھے اور بھی تو کام ہے۔ ابھی پنچایت ہی کا معاملہ باقی ہے—

البتہ تم ضرور تیار ہو جاؤ کل صبح کے لئے"

"کمل کو بھی ساتھ لے جاؤں پاپا"

"وہ جانا چاہے تو ضرور لے جاؤ" رائے بہادر صاحب نے اجازت دیدی۔

"وہاں تمہارا بنگلہ موجود ہے"

"تو ہم لوگ ضرور جائیں گے پاپا" جیون خوش ہو گیا۔

"بڑا شاندار پروگرام رہے گا۔
"ضرور۔! رائے بہادر صاحب اٹھتے ہوئے بولے۔
"اچھا جا کر اب تم بھی آرام کرو۔ آج سردی کچھ زیادہ ہے۔"
اور پھر جب جیون جانے لگا تو وہ اسے روک کر بولے۔
"مگر دیکھو صبح پانچ بجے جانا ہے۔ تمہیں یہاں سے صبح جلدی اٹھنا ہوگا جانا۔
"نہیں پاپا۔ بالکل نہیں۔
جیون خوش خوش چلا گیا۔ اور رائے بہادر صاحب بڑی پیار بھری نظروں سے اسے دیکھتے رہے اور وہ بڑی تمناؤں کے ساتھ بولے۔
"ایشور جتیا رکھے اسے۔"

جیون کی جیپ چالیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دھول اور گرد کے بادل اپنے پیچھے چھوڑتی ہوئی بھاگی چلی جا رہی تھی۔ جیون خود سٹیرنگ پر بیٹھا تھا۔ اور اس کے پاس ہی اگلی سیٹ پر کملا اپنے نئے خریدے ہوئے سمور کے کوٹ میں ڈھکی ہوئی بیٹھی تھی۔ اس کے کان کے آویزے برف کی طرح سرد ہو رہے تھے۔ اور اس کے گوگلس پر بھی کہر چھا گئی تھی۔ جیون نے اپنے بھاری اوور کوٹ کے کالروں کو کھڑا کر لیا تھا۔ اور گرم مفلر اس کے کانوں میں لپٹا ہوا تھا۔

جیپ کی پچھلی نشست پر فضل کریم اور راجیت پرشاد بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ وہ کارندے تھے جنہیں رائے بہادر نے دینا پور جیون کے ساتھ بھیجا تھا۔

جیپ کی پچھلی نشست پہ دو بندوقیں رکھی ہوئی تھیں۔ اور کارتوس کی ایک چھوٹی سی پیٹی رکھی ہوئی تھی۔ اور ایک بڑی سی ہنڈیا میں کچھ کھانے پینے کا سامان بھی تھا۔ جیلی اور جام کے ڈبے مکھن کے ٹن اور پوٹیٹو چپس اور بسکٹوں کے کئی پیکٹ۔ مچھلی اور چیزیں۔

جیپ کی ہیڈ لائٹس جل رہی تھی کہ سامنے اسی لائٹ میں ایک چیتا نظر آیا جو نہ جانے کیوں بیچوں سڑک پہ بڑے اطمینان سے بیٹھا ہوا تھا۔

"چھوٹے سرکار ——!" فضل کریم کا نا پھوسی والے انداز میں بولا۔

"وہ دیکھئے سامنے"

"دیکھ رہا ہوں" جیون نے جیپ کی رفتار کم کرتے ہوئے کہا۔

"ذرا رائفل تو دینا۔"

"کار توش ہے اکیس سرکار" اجیت پرشاد بولا۔

"ہوں ——"

اور جب جیپ ذرا قریب آئی تو چیتا جو بڑے اطمینان سے بیچ سڑک پر بیٹھا تھا۔ اٹھ کر سڑک کے داہنے کنارے پر آگیا۔ کوئی سو فٹ کے فاصلہ پر پہنچ کر جیون نے جیپ روک دی۔ اور اس کا رخ اس انداز میں موڑا کہ لائٹ چیتے کے منہ پر بدستور پڑتی رہے۔ چیتا روشنی میں گھرا ہوا بڑی غضبناک نگاہوں سے اسی طرف دیکھ رہا تھا۔

"جانے دیجئے چھوٹے سرکار! چھوڑ دیجئے" اجیت پرشاد نے ہولے سے گھگھیاتی ہوئی آواز میں مشورہ دیا۔

"بھیا ——!" بملا اپنے بھائی جیون کے پہلو سے لگ کر آہستہ سے بولی۔

"نشانہ نہیں لگاؤں گی"

اور جیون نے آہستہ سے رائفل بملا کی طرف سرکا دی کہ اتنے میں چیتے کے دو بچے سڑک کی بائیں طرف کی جھاڑیوں سے نکل کر سڑک کے داہنی طرف آگئے

"ارے یہ تو مادہ ہے چھوٹے سرکار —" فضل کریم چپکے سے بولا۔

"دیکھ رہا —"

اور ابھی جیون کا جملہ پورا بھی نہ ہُوا تھا کہ رائفل کی گرجدار آواز سے پورا جنگل گونج اُٹھا۔ چیتے کی مادہ بملا کے نشانے سے زخمی ہو چکی تھی۔

مگر وہ ایک زور کی چیخ مار کر جیپ پر کودی۔ اور پھر دوسرے فیر کی آواز پر اسی جگہ بیچوں بیچ سڑک پر جیپ سے صرف ایک گز کے فاصلہ پر گر کر ٹھنڈی ہو گئی۔

"ولڈن بملا ولڈن —" جیون بڑے پیار سے بملا کو بھینچ کر چیخا۔

"یہ دکھائی ہے تم نے راجپوتی شان۔ شاباش —"

"مگر اِدھر تو دیکھئے۔" بملا نے جیپ کی پچھلی سیٹ کی طرف اشارہ کر دیا۔

لالہ اجیت پرشاد حواس باختہ ہو کر سیٹ کے نیچے اوندھے پڑے ہوئے تھے۔

"ارے —!" جیون ہنسا۔

"فضل کریم دیکھنا کہیں ہمارے اجیت پرشاد کی دھوتی تو نہیں خراب ہو گئی۔"

کہ اتنے میں اجیت پرشاد کو فضل کریم نے اُٹھایا۔ اور وہ حواس باختہ ہو کر بولے۔

"مار ڈالا ہمیں چھوٹے سرکار — میرا تو خیال تھا چیتا —"

اور پھر ان کی نظریں سامنے پڑے ہوئے درندے پر گڑ گئیں۔ اور وہ ہکلاتے ہوئے بولا —

"غضب کا نشانہ ہے بٹیا کا —"

"مگر ہم اسے لے کیسے چلیں گے سائنہ" جیون جیپ سے نیچے اتر کر بولا۔

"کافی لمبی چوڑی تو ہے یہ بادہ"
"دینا پور یہاں سے صرف تین میل اور رہ گیا ہے۔ جھوٹے گریم بولا۔
"آپ فکر نہ کیجئے۔ اس کی۔ گاؤں پہنچکر میں اس کے اٹھوانے کا انتظام کرا لوں گا"
"ٹھیک ــــ ویری گڈ ــــ" بملا بولی۔
"میں اس کی کھال پاپا کو دکھانا چاہتی ہوں"
"کہ دیکھئے کتنا بڑا چیتا مارا ہے۔ آپ کے بشبانے" جیون مسکرایا۔
"اور نہیں تو کیا ــــ" بملا اکڑ گئی۔
"کوئی معمولی بات ہے؟"
"نہیں سچ مچ تم نے کمال کر دیا میں" جیون نے پیار سے بملا کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔
"مجھے خود اپنی بہن کی اس دلیری پر فخر ہے"
"جی! شکریہ"
بملا نے کورنش بجا لانے والے انداز سے گردن جھکائی
اور پھر یہ لوگ دینا پور کی طرف روانہ ہو گئے۔
سارے دینا پور میں یہ خبر بجلی کی طرح کی سی سرعت کیساتھ پھیل گئی کہ گاؤں میں جاگیر دار صاحب کے صاحبزادے صاحب تشریف لائے ہیں۔ پھر کیا تھا ان کی کی آن میں پورا جاگیر دار صاحب کے بنگلہ پر اٹھ آیا۔

ہر ایک کے ہاتھوں میں کوئی نہ کوئی بھینٹ تھی۔ کوئی نہ کوئی نذرانہ تھا۔ وہ سب کے سب بنگلہ کے احاطہ اور سائبان میں آ آکر جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔

ابھی صبح کے صرف سوا سات بجے تھے جیون گرم پانی سے غسل رہا تھا۔ اور بملا اپنی اونی شال اوڑھے آتشدان کے قریب ایک کرسی پر بیٹھی آتش دان کے چٹخنے اور اچھلتے ہوئے شعلوں کو بغور دیکھ رہی تھی۔ اندر باورچی خانہ میں نوکر ناشتہ تیار کر رہے تھے۔ گائے کا تازہ دودھ اُبل رہا تھا۔ انڈے اُبل رہے تھے۔ اور مرغ کا چوزہ بھنا جا رہا تھا۔ پراٹھے تیار ہو رہے تھے اور کیتلی میں چائے کیلئے پانی گرم ہو رہا تھا۔

گومتر بُٹ اور پاسی جو ہر گاؤں میں زمیندار کی طرف سے کاشتکاروں کو بلانے کے لئے نوکر ہوتا ہے۔ صبح ہی صبح منہ اندھیرے ان لوگوں کی آمد کی اطلاع پورے گاؤں کو دے آیا تھا۔

ناشتہ سے فارغ ہو کر جیون اور بملا بنگلہ کے باہر والے بڑے سائبان میں آکر بیٹھ گئے۔ وہ دونوں گرم قیمتی کپڑوں میں ملبوس تھے۔ انہیں دیکھتے ہی دیہاتی اٹھ کھڑے ہو گئے۔ سب نے بڑے ادب سے جھک کر اپنے مالکوں کو سلام کیا اور کورنش بجا لائے۔

"بیٹھ جائیے آپ لوگ" جیون بڑے پیار سے ان لوگوں کو دیکھ کر بولا۔

"میں آپ لوگوں سے چھوٹا ہوں۔ آپ میرے بزرگ ہیں۔

سبھوں نے یکے بعد دیگرے نذریں گزارنی شروع کیں جس کی جتنی توفیق تھی پھل سبزیاں مرغ۔ تیتر بٹیر۔ دودھ مچھلیاں۔ انڈے اور حلوان یعنی بکرے بھی۔

"ارے یہ سب کیا ہے -! اور آخر کیوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ؟"
جیون ان تحائف کے ڈھیر کو دیکھ کر بولا -
"اتنی بڑی لوٹ -!" بملا بڑے دکھ سے بولی -
"نہیں چھوٹے سرکار ـــــ" فضل کریم کارندہ بولا -
"یہ آپ کا حق ہے"
"یہ نذرانہ ہے بیٹا -" اجیت پرشاد نے بملا کو سمجھایا"
"حق ـــ! نذرانہ ـــ!!" جیون چیں بہ چیں ہو کر بولا -
"یہ ظلم ـــ لوٹ اور زیادتی کے سوا کچھ نہیں ہے"
اور پھر وہ ان تمام دیہاتیوں سے مخاطب ہوا ـــ"
"لے جایئے آپ لوگ یہ تمام چیزیں"
"نہیں حضور ـــ مائی باپ" ایک بوڑھے دیہاتی نے ہاتھ جوڑ کر اپنے ساتھیوں کی ترجمانی کی -
"قبول فرما لیجیے سرکار ان چیزوں کو ـــ یہ ہمارا فرض ہے - دھرم ہے یہ ہمارا"
"عجیب بات ہے" بملا بڑبڑائی -
"یہ عجیب بات نہیں - پرانا دستور ہے یہ - جب گاؤں میں گاؤں کا مالک آتا ہے تو ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے"
فضل کریم اور اجیت پرشاد دونوں ایک زبان ہو کر بولے -
"یہ ریت بڑی پرانی ہے"

"تو گویا پرلسنے پاپی ہیں ہم لوگ"
جیون کے چہرے پر ایک زہر خندہ مسکراہٹ پھیل گئی۔
اور پھر اس کے بعد ایک کاشتکار آگے بڑھا۔ اور اپنے حسبِ توفیق اس نے جیون کے حضور میں رقمیں پیش کرنی شروع کیں۔
دس ، پانچ ، دو چار اور ایک روپیہ بھی ۔۔۔ اور یہ سب رقم چاندی کے سکوں کی شکل میں تھی۔
"اور یہ کیا ہے۔ ؟" جیون نے دریافت کیا۔
"لگان ہو گا" ملا نے قیاس آرائی کی۔
"یہ اسامیات کا نذرانہ ہے۔ کہ آپ اس گاؤں میں پہلی مرتبہ تشریف لائے ہیں"
"یہ بہت پرانی رسم ہے"
فضل کریم اور اجیت پرشاد، دونوں نے مل کر جاگیرداری نظام کی یہ صدیوں پرانی رسم جیون کو سمجھائی۔
"ہوں ۔۔۔ !" جیون بڑبڑایا۔
"تو گویا زمینداروں اور جاگیرداروں نے لوٹ کی قسمیں بنا رکھی ہیں"
"بہت بڑا ظلم ہے یہ ۔۔۔" ملا کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں۔
اور جب پورا گاؤں نذریں گذار چکا تو جیون نے کھڑے ہو کر گاؤں والوں کو مخاطب کیا۔
"بزرگو اور دوستو !
آپ لوگوں نے اپنے جس خلوص کا اظہار کیا ہے اس کیلئے میں اور میری

بس ملا آپ کے ممنون - اور یہ ہماری دلی آرزو ہے کہ آپ کی جمع کی ہوئی یہ رقم ہم آپ لوگوں کی اپنی طرف سے بھینٹ کر دیں ۔ یہ آپ لوگوں کے کسی بُرے وقت میں کام آئے گی اس قسم سے آپ لوگ اپنی بھلائی کیلئے بہت سے کام کر سکتے ہیں۔ اور رقم کو آپ لوگ اپنے گاؤں کے چوہدری کے پاس جمع کر دیں - اور وقت ضرورت اس سے اپنا کام نکالئے ۔

اور یہ کہہ کر جیون نے فضل کریم کے سامنے سے وہ کپڑا اٹھا لیا جس میں چاندی کے سکے جگمگا رہے تھے ۔

"یہ کیا کر رہے ہیں - آپ چھوٹے سرکار" اجیت پرشاد جیسے بوکھلا گیا ہو" یہ آپ کا حق ہے ۔

اور جیون اجیت پرشاد اپنے کارندے کی ان باتوں کیطرف دھیان دیئے بغیر بولا۔ "میں گاؤں کے چوہدری صاحب سے بنتی کرتا ہوں کہ وہ اس رقم کو میری طرف سے قبول کر لیں۔

ایک کاشتکار بوڑھا مجمع میں سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا -

"سرکار یہ آپ کا حق ہے - آپ اسے ہماری طرف سے قبول فرما لیجئے"

"رحمان کاکا بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں" اجیت پرشاد پھر بولا -

"چھوٹے سرکار ابھی نادان ہیں - ان باتوں کو نہیں سمجھتے"

"کیا بکواس لگا رکھی ہے تم نے -- بملا نے جل کر اجیت پرشاد کو ڈانٹا اور وہ سہم کر بیٹھ دھو گیا -

"مگر سرکار -- " چوہدری رحمان کچھ بولنا چاہتا تھا - کہ بملا نے اس کی بات کاٹی -

"نہیں چاچا۔ یہ ہماری بھینٹ ہے۔ اور آپ لوگوں کو اسے سویکار کرنا ہی پڑیگا۔"

"بڑے سرکار برا مان جائیں گے بیٹی" رحمان چودھری بولا۔

"وہ برا نہیں مانیں گے چاچا" جیون بولا۔

"اپنے پتا جی کو ہم اچھی طرح سمجھتے ہیں"

"اور پھر ہم نے آپ کی بھینٹ سے انکار کب کیا۔ ہم تو اسے اپنی طرف سے آپ لوگوں کو دے رہے ہیں۔ کملا نے سمجھاتے کے طور پر کہا۔

"لیلو چودھری چھوٹے سرکار کی یہ بھینٹ" فضل کریم بولا۔

اور چودھری نے آگے بڑھ کر رقم کی وہ تھیلی جیون کے ہاتھ سے لے لی۔
اس نے اپنا سر جھکا کر کملا اور جیون کو نمسکار کیا۔

چھوٹے سرکار کی جے۔ اور چھوٹی مالکن زندہ باد کے نعروں سے پورا ماحول گونج اٹھا۔ دیہاتیوں کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ مارے خوشی اور ممنونیت کے بہتوں کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ وہ لوگ اچھل رہے تھے۔ کود رہے تھے۔ اور ناچ رہے تھے۔

"اچھا اب یہ چیزیں جو اب یہاں ڈھیر لگ گئی ہیں انہیں بھی آپ لوگ واپس لے جائیں۔ مفت میں اتنی بہت سی چیزیں یہاں پڑی رہ کر ضائع ہو جائینگی"

اور جیون نے لاکھ انکار پر بھی وہ چیزیں گاؤں والوں کو واپس کر دیں اور اجیت پرشاد جل بھن کر کباب ہو گیا۔ کاشتکاروں کی خوشی کی انتہا نہیں تھی۔

فضل کریم نے کھڑے ہو کر کہا۔

"چھوٹے سرکار اس فصل کا لگان وصول کرنے آئے ہیں۔

"ہم لوگ حاضر ہیں سرکار۔" مجمع بولا۔
"آج نہیں کل۔" جیون نے کہا۔ "کل آپ لوگ لگان لے کر آئیے گا۔"
اور پھر مجمع خوشی کے نعرے لگاتا۔ اور جے جے کار کرتا ہوا واپس چلا گیا۔۔ دھرتی کے سینے سے کھانے پینے کی چیزوں کا خزانہ جمع کرنے کے لئے۔۔

دینا پور سے کوئی تین چار میل کی دوری پر جیون بملا کے ساتھ فضل کریم کو لے کر شکار کھیلنے گیا۔ جیپ کار آہستہ آہستہ چھوٹی پگڈنڈیوں اور دشوار گذار راستوں پر سے گزر رہی تھی۔ کہ سامنے دور پہاڑی کے دامن میں چیتیوں کا ایک جھنڈ نظر پڑا۔ جیون نے راستہ کاٹ کر جیپ ایک رستہ پر ڈال دی جو کھیتوں کے بیچ سے ہو کر گزرتا تھا۔ اور اس طرح چوروں کی طرح وہ چیتیوں کے جھنڈ کے قریب پہنچ گیا۔ یہی کوئی دو سو گز کے فاصلے پر۔

اس نے ٹو ول بور کا نشانہ لگایا۔ اور کارتوس کے بڑے بڑے چھرّے سنسناتے ہوئے چیتلوں کے جھنڈ پہ بلائے ناگہانی کی طرح برس پڑے دو چیتل زخمی ہو کر گرے۔ اور جیون بھاگ کر زخمی چیتیوں کے سر پہنچ گیا۔ بملا جیپ سے کود پڑی۔ اور اس کے ساتھ ہی فضل کریم اور جیون بھی۔ فضل کریم نے جیب سے ایک بڑا چاقو نکالا۔ اور اسے کھول کر وہ ایک چیتل کو ذبح کرنے لگا۔ جیون نے دیکھا کہ چیتل کا ایک خوبصورت بچہ [illegible] سامنے

سے بھاگا چلا آرہا ہے۔ وہ بندوق لیے ہوئے اس کے پیچھے بھاگا چلا رہا تھا وہ بندوق لیے ہوئے اس کے پیچھے بھاگا۔ چیتل کا بچہ آگے آگے اور وہ پیچھے پیچھے۔

بھاگتے بھاگتے وہ بچہ پہاڑی پر چڑھ گیا۔ اور اس کے پیچھے پیچھے جیون بھی۔ پہاڑی کے اوپر بیشمار درخت تھے۔ چھوٹے بڑے پہاڑ گھنے گھنے لمبی لمبی گھاس تھی۔ اور خودرو بیلیں اِدھر اُدھر جال کی طرح ہر طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ اور یہاں پہنچکر چیتل کا بچہ تو نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اور اس کی تلاش میں ادھر اُدھر ٹھوکریں کھانے لگا۔ بار بار اس کے قدموں سے یہ خودرو بیلیں لپٹ لپٹ کر جاتیں اور درختوں کی جھکی ہوئی شاخیں اس کا راستہ روک روک لیتیں۔ کئی دفعہ تو وہ جھکی ہوئی خمیدہ شاخوں سے ٹکرا بھی گیا۔

بڑے بڑے لال چیونٹے اس کی ٹانگوں پر چڑھ گئے۔ ایک نے اس کی گردن پر کاٹا۔ اور وہ تلملا گیا۔ اور وہ دیوانہ وار اپنے پیر پٹکتا اور دونوں ہاتھوں سے چیونٹوں کو اپنے جسم پر سے جھاڑتا ہوا بھاگا۔ بندوق اس کے شانے پر لٹکی ہوئی تھی۔ سامنے ایک سیاہ رنگ ناگ اپنا پھن پھیلائے اور کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ اپنے نزدیک اتنے خوفناک سانپ کو دیکھ کر جیون حواس باختہ ہو کر الٹے پاؤں پیچھے لوٹا۔ اس کی نگاہیں سانپ پر جمی ہوئی تھیں۔ اور وہ برابر الٹے پاؤں پیچھے لوٹ رہا تھا۔ کوئی چالیس پچاس گز کے فاصلے پر جاکر وہ رکا اور اس نے اپنے کندھے پر سے بندوق اتار لی اور وہ اس خطرناک سانپ کو نشانہ بنانے ہی والا تھا کہ کسی نے پیچھے سے لپک کر اس کی بندوق کی نال پکڑ لی۔

اور جیون جھنجھلا گیا۔ وہ غصہ کرنا چاہتا تھا۔ مگر بھوچکا سا رہ گیا۔
اسکے سامنے ایک بڑی معصوم سی لڑکی تھی معصومیت کا اتنا عظیم شاہکار ابتک اس کی نظر سے نہیں گزرا تھا۔ بڑی بڑی مست اور بے خود کر دینے والی شرابی آنکھیں جیسے دو کنول کھلے ہوئے ہوں۔ گلاب کی پنکھڑیوں جیسے سرخ سرخ ہونٹ۔ گھنی اور سایہ دار پلکیں خوبصورت اور باریک بھنویں جیسے چمکتی ہوئی شمشیر گالوں پر حیا اور کنوار پنے کی ایک ایسی سرخی جو قوس و قزح کے تمام رنگوں سے زیادہ لطیف اور پاکیزہ ہو۔ چہرے پر ایک ایسا جلال۔ ایک ایسی چمک، ایک ایسا نور۔ جس کی عظمت کی قسم تک کھائی جا سکے۔ ایک ایسی قسم جو پاک ہو اور مقدس ہو۔

جیون نے محسوس کیا۔ جیسے کہ اسکی رگوں میں کسی نے خون کی جگہ گرم گرم کوئی سیال مادہ بھر دیا ہو۔ اس کے تن بدن میں بجلیاں سما گئیں اور وہ مبہوت بے حس و حرکت کھڑا ایک ایسے وجود کو دیکھتا رہا جو اگر شاید وجود میں نہ آیا ہوتا تو یہ دنیا ہی وجود میں نہ آئی ہوتی۔ اور اگر وجود میں آتی بھی تو نامکمل ہوتی۔ بے کیف اور بے جان۔

اور جیون کو اس طرح مبہوت دیکھکر وہ بولی۔

"یہ ناگ دیوتا ہیں — بابا کہتے ہیں کہ وہ کئی سو برس سے یہاں رہتے ہیں۔ اس پہاڑی پر۔ اور آج تک انہوں نے کسی کو تنگ نہیں کیا۔ کسی کو نہیں ڈسا نہ کسی جانور کو نہ کسی آدمی کو۔ وہ تو بلکہ رکشا کرتے ہیں۔ سب کی۔"

وہ بولتی گئی اور جیون اسے کھوئے ہوئے انداز میں دیکھتا رہا۔ جیسے کہ وہ پتھر کی بے جان مورت بن کر رہ گیا ہو۔

"تو کیا تم میری بات جھوٹ سمجھتے ہو!" وہ معصومیت سے بولی۔

"اچھا تو آؤ میرے ساتھ میں بابا سے پچھوا دوں!"

"نہیں! نہیں!!!" جیون نے اپنے ہوش وحواس جمع کئے۔

"میں جھوٹ نہیں سمجھتا!"

"اگر کہیں ایشور نہ کرے تم ناگ دیوتا کو مار دیتے تو جانتے ہو کیا ہوتا!"

"کیا ہوتا ـــ"

"بہت بُرا ہوتا!"

"اچھا ـــ!"

"ہوں! نہیں تو کیا تم سمجھتے ہو کہ اچھا ہوتا!"

اور یہ کہکر وہ لڑکی وہاں سے چلی گئی۔ جیون کا جی چاہا کہ وہ نہ جائے اُسنے کئی بار کوشش کی کہ وہ اسے روک لے۔ اسے پکار لے۔ آواز دے لے لیے مگر وہ کچھ بھی نہ کر سکا۔ جیسے کہ کسی نے اسے پر مسمریزم یا جادو کر دیا ہو۔ وہ کھڑا رہا۔ اسی جگہ ـــ اسی ایک انداز میں۔ بالکل بے حس وحرکت۔

اور لڑکی اب اس کی نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی لیکن سامنے ناگ دیوتا اسی طرح پھن پھیلائے اور کنڈلی مارے بیٹھے رہے! اور وہ انہیں بغور دیکھتا رہا۔

"بھیّا ـــ!" یہ بملا کی آواز تھی۔ اور جیون اس آواز پر چونک پڑا اس نے ادھر اُدھر دیکھا۔ سامنے سے بملا اور نفیسا کہ ہم اسے تلاش کرتے ہوئے چلے آرہے تھے

"کہاں کھو گئے تھے آپ ـــ" بملا اس کے قریب آکر بولی۔

"کب سے ہم لوگ آپ کو تلاش کر رہے ہیں!"

"بھئی اس شرکار نے تو مجھے پریشان کر دیا۔" جیون مسکرایا۔

"ایسا غائب ہوا جیسے گدھے کے سر سے سینگ!"

"تو اتنا پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے آپ کو" بملا جیون کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے حیرت سے بولی۔

"بھیا — ! یہ آپ کو ہو کیا گیا ہے — ؟"

"کچھ بھی تو نہیں۔" جیون نے بملا کے بازو کو پکڑ کر کہا۔

"اچھا آؤ۔ اب ہم لوگ واپس چلیں!"

دور مہوے کے درخت کے نیچے اُن کی جیپ کھڑی تھی۔ اور وہ تیزی کے ساتھ طرف بڑھنے لگے۔

آج رات گاؤں کے چودھری کی طرف سے جیون اور بملا کے اعزاز میں ایک شاندار ناچ اور نقل کا انتظام کیا گیا ہے۔ جاگیردار صاحب کے بنگلہ کے کمپاؤنڈ میں شامیانے تان دیئے گئے تھے۔ جس کے چاروں طرف جھولداریاں کھڑی کی گئی تھیں۔ نیچے زمین پر دریوں اور پھر اس پر سفید چاندنی کا انتظام تھا۔

جیون اور بملا کے لئے الگ بیٹھنے کا انتظام بڑا شاندار اور اعلیٰ پیمانہ پر لوگوں نے کیا تھا۔ دیہاتی رقص و موسیقی کے علاوہ بطور خاص گاؤں کے چماروں کی ایک ٹولی نے اپنے طرز کے ایک خاص ناچ کا اور نقل کا انتظام کیا تھا۔ اور یہ چماروں کا ناچ گاؤں میں "چمر نچنیا" ناچ کے نام سے مشہور تھا۔

جیون اور بملا کو یہ ناچ دیکھنے کی تمنا تھی۔ انہوں نے بڑی خندہ پیشانی اور بڑی خواہش کے ساتھ اس تقریب کی حوصلہ افزائی کی تھی۔

رات کے آٹھ بجے سے یہ خاص پروگرام کی محفل رقص و سرود گرم ہوئی۔

روشنی کا انتظام بھی بڑا عجیب و غریب اور دلچسپ تھا۔ لوہے اور ٹین کے جنگلے "نما فانوس" کے اندر رکابیوں کو بھر کر ان ابلیوں کو مٹی کے تیل سے تر کر کے جلا دیا گیا تھا۔ اور متعدد لڑکے ان "فانوس" کو بانسوں کی لکڑیوں پر اٹھائے ہوئے تھے۔

اور کئی ایک مشعلیں بھی جل رہی تھیں۔

ناچ شروع ہوا۔ ایسا ناچ جسے دیکھ کر عہد قدیم کے ان ناچوں کا نقشہ آنکھوں میں پھر گیا جنہیں جیون اور رمیلا نے اب تک نہیں دیکھا تھا۔ صرف پرانی کتابوں اور تاریخ کے صفحات پر ہی یہ ناچ بکھرے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔

ایک قوی ہیکل شخص نے جو صرف دھوتی پہنے ہوئے تھا۔ اور جس کے کانوں میں یہ بڑے بڑے بالے لٹک رہے تھے۔ اور جس کے بازوؤں کی مچھلیاں پھڑک رہی تھیں۔ بڑے جوش کے ساتھ اچک اچک کر اپنا مردنگ بجانا شروع کیا بڑے معصوم اور دلنواز اودھم کے ساتھ یہ مردنگ بج رہا تھا۔

اور پھر تھوڑی دیر کے بعد ہجوم کے گوشے سے یکے بعد دیگرے دیہاتی دوشیزائیں ایک عجیب دلفریب انداز میں رقص کرتی ہوئی سامنے آتی ہوئی دکھائی دیں۔ ان کے ہاتھوں میں درانتیاں تھیں۔ اور سروں پر ٹوکریاں اور پھر جب وہ سب کی سب سامنے آگئیں۔ تو انہوں نے ایک بڑے دلکش انداز میں اپنے کاموں کی تفصیل اس ناچ کی شکل میں پیش کی۔ ان کے ناچ کا مفہوم تھا کہ ہم ——

ہم کسان عورتیں رات کے پچھلے پہر سے اٹھ کر سب سے پہلے کس طرح بڑے والہانہ انداز میں چکی پیستی ہیں۔ تاکہ ہمیں آٹا میسر آسکے۔ اور پھر اس کے بعد کس طرح

دودھ گرم کرتی ہیں کس طرح دودھ جماتی ہیں۔ اور کس طرح دودھ بلو کر دودھ سے مکھن نکالتی ہیں۔ پھر کس طرح ہم روٹی پکاتی ہیں۔

اور پھر کس طرح اپنے بچوں کو روٹی دیکر ہم اپنے شوہروں کی مدد کیلئے روٹی کی ڈلیا سروں پر رکھ کر ان کے کھیتوں پر پہنچ جاتی ہیں۔ اور کس طرح وہاں پہنچکر اپنے جفاکش اور محنتی شوہروں کی پیشانیوں کا پسینہ اپنے آنچلوں سے پونچھ کر انکی حوصلہ افزائی کرتی ہیں۔ اور پھر اپنے شوہروں کو پیار و محبت سے کھانا کھلا کر کس طرح ہم ان کے ساتھ ان کاموں میں ہاتھ بٹاتی ہیں۔

کھیت کاٹتی ہیں۔ کھیت نراتی ہیں۔ کھیت میں بیج ڈالتی ہیں۔ اور کس طرح ہم کھیتوں کی مینڈوں میں پانی دیتی ہیں۔

اور پھر کھیتوں میں فصل بوئے جانے فصلوں کے اُگنے بڑھنے۔ پکنے اور پھر ان کے کٹنے تک کا منظر اسی خوبصورت ناچ کے ذریعہ ان عورتوں نے پیش کیا تھا۔ اور ناچ کے ساتھ میٹھے سروں میں۔ گاؤں کی دھنیں بھی تھیں جو کاموں کی تقسیم اور ان کی نوعیت کو واضح کرنے میں مدد دیتی ہیں۔

ان گانوں کے بول ایسے تھے۔ جنہیں سنکر تھکن کا احساس دور ہو کر جسموں میں چستی اور پھرتیلا پن پیدا ہوتا ہے سننے والے کے جوش ابھرتا ہے بڑا ہی دلکش۔ دلپذیر اور حسین ناچ تھا۔ یہ ایک ایسا ناچ جس کا تصور بھی اب سے بہت پہلے جیون اور بملا نے کیا تھا۔ شہروں کے تھیٹروں، سینماؤں اور کلبوں میں جس ناچ کی ایک ہلکی سی پرچھائیں کبھی نہیں پڑی تھی۔ ایک اس قسم کا رقص جو انتہا سے زیادہ دلچسپ ہو بامعنی ہو اور جو دلوں میں ایک

نیا ولولہ پیدا کر دے جو سخت اور محنت کش کاموں کو اپنے اندر جذب کرے۔ جو محنت سے تھکتا نہیں بلکہ محنت میں ڈوب جانا سکھا دے جس کے ساتھ کے میٹھے میٹھے بول کاموں کو ہلکا کر دیں۔

بہت دیر تک جیون اور ممبا پر جوش تالیاں بجاتے رہے سچ سچ یہ ناچ انہیں دل کی انتہائی گہرائیوں کے ساتھ پسند آیا تھا۔

اور پھر اس کے بعد بہت سی نقلیں ہوئیں۔ تماشے ہوئے اور دیہاتی گیتوں کے مدھر بولوں میں ان دونوں بھائی بہنوں کا دل ڈوب ڈوب کر ابھرا اور ابھر ابھر کر ڈوب گیا۔

اور پھر سب سے آخر میں "چمرنچنا کا ناچ" ہوا۔ ہنستے ہنستے ممبا اور جیون کے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ وہ بے حد خوش ہوئے۔ اتنا کہ ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اور اپنے مالکوں کو اس خوشی اور پسندیدگی پورے گاؤں کا دل باغ باغ ہو گیا۔ جیون نے تماشا کرنے والوں کو انعام و اکرام دیئے۔ اور ان کی خوب دل کھول کر تعریف کی۔

اور کہیں رات کے بارہ بجے جا کر یہ دلچسپ محفل ختم ہوئی۔

بملا سو گئی تھی - مگر جیون کی آنکھ ابھی تک نہیں لگی تھی وہ ابھی تک کروٹیں بدل رہا تھا - ایک ایسی بات جو دن سے لیکر اس وقت تک کئی بار اس کے ذہن میں ایک انجانی خواہش کی طرح چبھ چکی تھی ! اور جسے دن سے لیکر اسوقت تک بھلانے کی اسنے کئی بار کوشش کی تھی اسوقت اس کے دل اور دماغ دونوں کو پریشان کئے ہوئے تھی - وہ بار بار جس خیال سے دور بھاگنا چاہتا تھا - وہی رہ رہ کر اسے تنگ کر رہا تھا -

رات کے سوا تین بج چکے تھے - اور آٹھویں کا چاند اپنا مرجھایا ہوا زرد چہرہ لئے ہوئے اسکی بند کھڑکی کے شیشوں سے اندر اسکے کمرے میں جھانک رہا تھا -

اس نے دو تین بار زور زور سے کروٹ لی اور پھر پریشان ہو کر وہ اپنے بستر پر سے اُٹھ کر بیٹھا - کچھ دیر یونہی پاؤں لٹکا کے اپنی مسہری پر بیٹھا رہا - اور پھر اُٹھ کر بغیر گاؤن پہنے ہوئے آہستہ سے دروازہ کھولکر باہر گیلری میں آگیا -

اور وہاں باہر سردی میں جنگلے سے لگ کر وہ کھوئے ہوئے انداز میں آسمان پر ٹمٹماتے ہوئے ستاروں کے جھرمٹ میں نہ جانے کیا تلاش کرنے لگا - برفیلی ہوا چل رہی تھی - ایسی ہوا جو جسموں کے آر پار ہو جائے مگر وہ کھڑا رہا - یونہی خالی سلیپنگ سوٹ پہنے ہوئے -

چاند افق کے قریب آسمان سے بہت نیچے لٹک آیا تھا - اور اس کا زرد چہرہ قدرے سرخی مائل اور مٹیلا ہو چکا تھا - دور جنگلوں میں اِکّا دُکّا بولیں کہیں کہیں گیدڑ بول رہے تھے - اور دور سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں مبہم آ رہی تھیں - کبھی کبھار کوئی بڑا سیاہ پرندہ اپنے پروں کو پھڑپھڑا کر

درختوں کی ٹہنیوں میں پھر سے اب جاتا۔

دور بہت دور روشنی کی ایک ہلکی سی کرن پھوٹنے لگی۔ اور پھر آہستہ آہستہ فضاؤں کے سینوں کو چیرتی ہوئی کسی میل ٹرین کے گذرنے کی صدا سنائی دینے لگی۔ سامنے میدان کے سرے پر جو کھنڈر پڑا ہوا تھا۔ اس کی گری ہوئی دیواروں اور لٹکی ہوئی منڈیروں پر اُلّو بول رہے تھے۔ایک آکر بیٹھتا اور دوسرا اسے ٹکر مارتا۔ اور اڑا دیتا۔ وہ گھوم کر آتا۔ اور بیٹھ جاتا۔ اور وہ پھر اسے جھپٹ کر مارتا اور وہ پھر اڑ جاتا۔

قیں قیں۔ قیں اور چق چق ہاچق کی آوازیں ماحول کو اور زیادہ بھیانک اور ڈراؤنا بنائے دے رہی تھیں۔ پورے ماحول پر ایک قسم کی ناپسندیدگی کے سے آثار پائے جاتے تھے۔

کھنڈروں کے درمیان سے کوئی چیز سر سے رینگ کر نکل گئی۔ اور جیون کی مہویت کا طلسم ٹوٹ گیا۔ وہ جیسے چونک پڑا ہو۔

اس پر کپکپی طاری ہو گئی۔ دانت بجنے لگے۔ اس کے بلا کی سردی تھی۔ اس وقت وہ اپنے داہنے ہاتھ کی مٹھی ہرے ہوئے اپنے ہونٹوں پر مارنے لگا۔ اور گرم سانسوں کی شی شی۔ شی پیدا ہونے لگی۔

وہ گیلری سے اندر آ گیا۔ وہ دروازہ اس نے بڑی مضبوطی کے ساتھ دبا کر بند کیا تاکہ باہر کی سرد ہوا اندر کمرے میں نہ آسکے۔ اور پھر وہ برف نما ہوا جلدی سے اپنے بستر کے اندر آکر گھس گیا۔

اور پھر بہت دیر تک گرم بستر پر لیٹے رہنے کے باوجود اس کی سردی

ختم نہ ہوئی اسے معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے کسی نے اسکے لبستر کو یخ لبتہ پانی سے بھگو دیا ہو۔ کچھ دیر بعد سردی کا یہ دباؤ ختم ہوا۔ اور اس کے لحاف کی گرمی اسکے جسم میں سرایت کرنے لگی۔ اسنے اپنی سکڑی ہوئی ٹانگوں کو آہستہ سے لبستر پر پھیلا دیا۔

اور اب سونے کی کوشش اس نے بڑی سنجیدگی اور انہماک سے شروع کر دی۔ مگر توبہ کیجیے ناگ دیوتا کی اس سچی پرستار دیوی کا خیال اسے سونے کب دیتا تھا۔ وہ پھر بدستور پہلے کی طرح کروٹیں بدلنے لگا۔

بار بار اس کے ذہن میں وہ معصوم حسن ابھرتا۔ اور اس کا دل اسکو ذہن حسن پر مچل جاتا۔ بڑی بڑی کٹورا جیسی آنکھیں اسکی آنکھوں میں بن کر سما جاتیں اس کی موہنی صورت اس کے ذہن کے پردوں سے ٹکرانے لگتی۔ اور وہ خود کو الہڑ دوشیزہ کے چہرے کی پر نور شعاعوں میں گھرا ہوا پاتا۔

اس کا دل اس کے پہلو میں ماہی بے آب بنکر تڑپ اٹھتا۔ اور اسے ایسا محسوس ہوتا کہ جیسے کوئی انجانی طاقت اس کے دل کو اپنی چٹکیوں سے مسل رہی ہیں بےرحم اور لگاتار۔

اور اب وہ ایسا محسوس کرنے لگا تھا کہ جیسے بغیر اس لڑکی کے نہ تو اب وہ جی سکے گا اور نہ مر سکے گا۔ اور اب اس لڑکی بغیر اس کی اپنی زندگی نذر ہ کر درد و عالم کی زندگی بن کر رہ جائے گی جس میں آہیں ہونگی۔ آنسو ہونگے اور بیقراریاں ہونگی۔ اضطراب ہوگا۔ بے چینی ہوگی۔ اور صعوبتیں ہونگی۔

وہ بار بار کوشش کرتا کہ اپنے دماغ سے اس رنجانی لڑکی کے خیال کو جھٹک کر باہر پھینک دیا۔ مگر وہ اپنی اس کوشش سے خود کو عاجز پا رہا تھا۔

بالکل ہی بے دست و پا اور لاچار۔

اس کی کیفیت بالکل ایک اس شخص کی سی تھی جو دریا کی موجوں میں پھنس کر خود کو بچانا چاہتا ہے۔ مگر نہیں بچا سکتا۔ کوشش کرتا مگر نہیں کر سکتا اسلئے کہ وہ تیرنا نہیں جانتا۔ اور اگر تیرنا جانتا بھی ہے تو اس وقت یہ عمل اسکے کسی کام نہیں آسکا۔ وہ تیرنا جانتے ہوئے بھی اس موقع پر آکر تیرنا بھول گیا ہے۔

زبردستی محض مرنے کے لئے کسی غیبی قوت نے اسکی یہ صلاحیت اس سے چھین لی ہیں۔

وہ اس لڑکی کے تصور سے بچنے کی جتنی زیادہ کوشش کرتا۔ اتنی ہی شدت ساتھ وہ اس کے ذہن کے۔ دل کے دماغ کے پردوں پر مسلط ہوتی جا رہی تھی بہت بڑی مشکل کا وقت تھا یہ۔ اور وہ ایک ایسی دلدل میں پھنس گیا تھا۔ جو اس کے بس کی بات نہیں رہ گئی تھی۔ وہ دل کو سمجھاتا تو وہ اور مچلنے لگتا۔ وہ دماغ سے کام لینا چاہتا۔ تو اسے احساس ہوتا۔ کہ اس کا دماغ اس ایک بات کی طرف سے قطعاً ماؤف ہو چکا ہے۔ اور اگر وہ عقل کو درمیان میں لانا چاہتا ہو تو اسکی عقل اس عقدے کو حل کرنے کے لئے کوئی تدبیر نہ سوچ پاتی۔

غرضیکہ اسے کچھ سجھائی نہ دیتا ہر چہار طرف سے وہ مایوس ہو چکا تھا۔

ساری رات اسی ادھیڑ بن میں جاگتے گذر گئی۔ اور جب صبح وہ اپنے بستر پر سے اٹھا۔ تو اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ آنکھیں ویران تھیں اور وہ بے تحاشا سا دکھائی دے رہا تھا۔

اور آخرش اس کی بہن نے گھبرا کر اس سے پوچھ ہی لیا۔

"کیا ہوا بھیّا۔ خیر تو ہے؟ یہ آپ کی حالت کیا ہو رہی ہے؟"

"نہ جانے ــــ"

"کیا مطلب ــ؟ بملا اور زیادہ پریشان ہو گئی۔

"ایشور نہ کرے، کہیں آپ بیمار تو نہیں ہو گئے۔"

اور وہ چپ رہا۔

"بھیّا ــــ!"

بملا اسے جھنجھوڑ کر بولی۔

"بتایئے نا کیا بات ہے"

"کوئی بات ہو تو بتاؤں پگلی۔"

جیون نے اپنے چہرہ پر مصنوعی مسکراہٹ پیدا کی۔

"مجھے کیا ہوا ہے"

"جی کچھ نہیں ہوا آپ کو۔"

بملا نے گردن مٹکائی ــ

"ذرا جا کر آئینے میں اپنی صورت تو دیکھئے!"

اور یہ کہہ کر وہ خود ہی لپک کر اٹھا لائی۔ اور اسے جیون کے سامنے کرتے ہوئے بولی ــ

دیکھئے ــ دیکھئے ــ دیکھئے تو ذرا اپنی صورت!"

"کیا بچوں سی حرکتیں کرتی ہو تم بعض وقت بملی!"

جیون کچھ چڑا سا گیا۔

"تم ان حرکتوں سے بھلے چنگے بھلے آدمی کو بھی بیمار کر ڈالو"

"اچھا تم کھلیئے میرے سر کی قسم کہ آپ کو کچھ نہیں ہوا"

"کچھ نہیں ہوا بابا۔ کہہ جو دیا ۔"

جیون اپنی بہن کی اس محبت پر مسکرایا۔

"مانو اماں جان ہی تو ہیں آپ ہماری"

"ہا۔ہا۔ہا ۔ بملا زور سے تالیاں بجانے لگی۔

"اب معلوم ہوا کہ ہمارے بھیا بول رہے ہیں۔ کیسے اچھے لگے آپ"

"سچ مچ مجھ بہت پریم کرتی ہے میری بہن"

جیون نے بڑے پیار اور بڑے غرور کے ساتھ بملا کے سر کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ اور وہ اسے تھپکتے ہوئے بولا۔

"ایشور ہر بھائی کو ایسی ہی بہن دے گا"

اور پھر وہ بملا کی ٹھوڑی اوپر اٹھا کر بولا۔

"تم — ! جیسی کہ تم میری بہن ہو —"

"بھیا — ! بملا جیون کے کمر میں اپنے بازو ڈال کر لپٹ گئی۔

"ایشور جانتا ہے بھیا۔ میں آپ کے لئے اپنی جان تک دے سکتی ہوں آپ کے حکم پر اپنا سر کٹا سکتی ہوں۔ دنیا لٹا سکتی ہوں۔ میں اپنے بھیا کے حکم پر"

"سچ — !

جیون کی آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔ مارے خوشی کے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے

بملا جیون کے سامنے تن کر کھڑی ہو گئی ۔
"کبھی آزما کر دیکھ لیجئے گا۔ بھیّا ۔۔۔! بملا حد سے زیادہ سنجیدہ ہو کر پورے عزم اور مکمل استقلال کے ساتھ بولی ۔
"اگر ایک بہن اپنے بھائی کے اشارے پر اپنا سر نہ کٹائے تو بھائی بہن کی محبت پر تھوک دیجئے گا۔ آپ ۔۔۔"
"بھائی بہن کی محبت کسوٹی کی محتاج نہیں بملی!"
جیون نے بملا کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ۔
"بھائی بہن کا لفظ خود محبت کی کسوٹی ہے!"

شام کو جب پانچ بجے جبکہ دل اور دماغ دونوں نے ملکر صبح سے لیکر اس وقت تک کی شدید کشمکش کے بعد عقل کو شکست دیدی تھی۔ جیون چوروں کی طرح چھپ کر چپکے سے اس منزل کی طرف ہولیا جہاں وہ کل اپنے ہوش و حواس لٹا آیا تھا۔

وہ ایک سفید گھوڑے پر بیٹھا ہوا تھا۔ اور اس کا گھوڑا سرپٹ اسے اپنی پشت پر بٹھلائے ہوئے کچی اور ہموار سڑک پر اپنے مالک کے اشارے پر بھاگتا چلا جا رہا تھا۔

سامنے پہاڑی دکھائی دینے لگی۔ اور جیون کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے شوق کی منزلوں کو جلد سے جلد پا لینے کے لئے اپنے گھوڑے کو ایک زور کی ایڑ لگائی اور وفادار جانور مالک کے اشارے پر تیر کی سی تیزی کے ساتھ بچا کھچا راستہ طے کر لینے کے بعد پہاڑی پر چڑھنے لگا۔ اس کے نتھنے پھول گئے تھے۔ اور اسکے منہ سے جھاگ نکل رہا تھا۔ اس کا سارا جسم پسینے کے سفید جھاگ سے لت پت ہو چکا

تھا۔ پسینہ اس کے پیٹ سے بہہ رہا تھا۔

پہاڑی کے اوپر پہنچکر جیون نے گھوڑے کی پشت پر بیٹھے ہوئے ادھر اُدھر اپنی نظریں دوڑائیں۔ مگر اسے وہ نظر نہ آئی جسکی جستجو اسے یہاں کھینچکر لائی تھی۔ نہ وہ تھی اور نہ اس کے دیوتا وہاں اسے نظر آئے۔ ناگ دیوتا جو بقول اس کے باباکئی سال سے اسی پہاڑی پر براجمان تھے۔ اور جنھوں نے آج تک کسی کو نہیں ڈسا تھا کسی کو گزند نہیں پہنچائی تھی۔

جیون کی بے چین نگاہیں بیقرار ہو ہو کر ادھر اُدھر دوڑ رہی تھیں اور اس کا گھوڑا اپنی ٹاپوں سے پتھریلی زمین کھود رہے ڈال رہا تھا۔ بار بار وہ اپنے نتھنے پھڑ پھڑاتا۔ اپنی گردن جھٹکتا۔ اور پھر کان کھڑے کر کے اپنی بڑی بڑی آنکھیں نکال کر ادھر اُدھر دیکھنے لگتا۔ جیسے کہ اسے بھی کسی کی تلاش ہو۔

اچانک ایک درخت کی جڑ سے وہ ناگ دیوتا باہر نکلے۔ اور قبل اس کے کہ جیون سنبھلے۔ اس کا گھوڑا کان کھڑے کر کے اور نتھنے پھُلا کر ہنہناتا ہُوا ایک طرف کو بھاگا۔ جیون نے اسے لاکھ روکا۔ چمکارا۔ لگام کھینچی۔ مگر سب بے سود۔ گھوڑا اسے لیکر پہاڑی کی دوسری طرف بڑی تیزی کے ساتھ نیچے اُتر رہا تھا۔ اس جگہ جہاں نشیب میں ایک چشمہ بہہ رہا تھا۔ اور میدان میں گیہوں کے چھوٹے چھوٹے کھیت لہلہا رہے تھے۔ اور یہ خطہ چاروں طرف سے چھوٹی پہاڑیوں سے گھرا ہُوا تھا۔

چشمہ کے کنارے جانور پانی پی رہے تھے۔ اور چرواہے اپنی اپنی لاٹھیوں کے سہارے بڑے اطمینان سے بیٹھے ہوئے گپ بازیوں میں مصروف تھے۔

ایک نوجوان چشمہ کے سرد اور میٹھے پانی میں اپنے پاؤں لٹکائے ہوئے۔ ایک

ابھری ہوئی چٹان پر بیٹھا بڑے والہانہ انداز میں بنسری بجا رہا تھا۔ اور بنسری کی میٹھی تانیں فضاؤں کے سینے کو چیر کر دور دور تک اپنا جادو پھیلا رہی تھیں۔

جیون کے گھوڑے نے اس نشیبی میدان میں اتر کر اپنی رفتار دھیمی کر دی۔ اس پر ناگ دیوتا کو دیکھ کر جو بدحواسی طاری ہوئی تھی وہ ختم ہو چکی تھی۔ جیون نے اس کا لگام کھینچ کر اسے روکا اور وہ کھڑا ہو گیا۔ چرواہے حیرت و استعجاب کی نظروں سے اپنی بانیں چھوڑ کر اس سوار کو تکنے لگے تھے۔ اور بنسری کی دل میں اتر جانے والی تانیں انس کی ننھی سی ملکی کے سینے میں سو گئی تھیں۔

جیون نے گھوڑے کی لگام پھرائی۔ اور اس کا گھوڑا ٹپ ٹپ کرتا ہوا چشمہ کے کنارے پہنچ کر رک گیا۔

"سنے! ادھر آؤ"

جیون نے بانسری بجانے والے اس نوجوان کی طرف دیکھ کر اشارہ کیا۔

اور وہ نوجوان کچھ ڈرا کچھ سہما ہوا پتھر کی چٹان پر سے اترا اور جیون کے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔

"سلام صاحب" اس نے بڑے ادب سے جھک کر سلام کیا۔

"تم نے بنسری کیوں بند کر دی؟"

نوجوان دیہاتی کچھ نہ بولا — وہ خاموش رہا —

"بجاؤ بنسری —"

بڑی خاموشی کے ساتھ نوجوان نے بنسری اپنی دھوتی سے صاف کی اور وہ بجانے لگا۔ کچھ دیر خاموش رہ کر جیون نے کہا —

"اس طرح نہیں — جیسے تم پہلے بجا رہے تھے!"

نوجوان لڑکے نے بانسری روک کر کہا۔

"پہلے میں اسے خود سے بجا رہا تھا حجور — اور اب آپ کے حکم پر!"

جیون نے بڑی بے چینی سے اس کی بات کاٹی —

"تو کیا —"

نوجوان لڑکے نے برجستہ جواب دیا —

"سرکار — ! دل کی بات ہوتی ہے۔ اور حکم کی اور!"

"سچ کہہ رہے ہو تم دوست —" جیون نے اس نوجوان کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"نغمے اپنے آپ سے پھوٹتے ہیں اور وہ کسی کے حکم کے تابعدار ہرگز نہیں ہوتے!"

"مگر میں آپ کا تابعدار ہوں حجور —" وہ نوجوان گھبرا کر بولا۔

جیون مسکرایا۔

"تم ہمارے تابعدار ہو۔ مگر تمہاری بانسری کے نغمے کسی کے تابعدار نہیں ہیں — نہ ہمارے اور نہ تمہارے — اور انہیں کسی کا تابعدار ہونا بھی نہ چاہیے — ورنہ پھر وہ نغمے نہ رہیں گے۔ وہ محنت بن جائیں گے۔ محنت — جو کی جاتی ہے۔ خود سے جنم نہیں لیتی!"

نوجوان منہ اٹھائے جیون کو دیکھتا رہا —

اور جیون نے بات کا موضوع بدلا —

"کیا کرتے ہو تم —؟"

"ہل جوتتا ہوں سرکار — اور ریوڑ چراتا ہوں!"

"اور —؟"

"اور رات کو، جوار - باجرے یا مکئی کی روٹی کھا کر سو جاتا ہوں"

"پڑھنا لکھنا جانتے ہو -؟"

"یہ کام میرے کنبے میں کسی کو نہیں آتا جوُر"

اور ان کی باتیں سنکر دوسرے دیہاتی بھی نزدیک آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔

ان میں سے ایک بولا -

"یہ کام آپ لوگوں کا ہے سرکار"

دوسرا بولا -

اسلئے کہ آپ ہل نہیں چلاتے - گائیں بھینسیں اور بکریاں نہیں چراتے جوُر"

"ہوں —— !"

جیون مسکرایا -

"ہم دھرتی کا سینہ چیر کر اناج جمع کرتے ہیں"

"اور آپ —— !"

ایک نوجوان دیہاتی کچھ کہتے کہتے رک گیا - اور جیون نے بڑی تسلی کے ساتھ اس سے پوچھا -

"ہاں ! اور ہم کیا کرتے ہیں"

"کھتا مایپ سرکار" وہ بولا -

"اور آپ ہمارا جمع کیا ہوا اناج لیجا کر بازار میں بیچ ڈالتے ہیں - اور پھر آپ شکار کھیلتے ہیں اور چین کی بنسی بجاتے ہیں جوُر -

جیون اس نوجوان دیہاتی کی اس صاف گوئی پر کچھ جھینپ سا گیا اور اپنی جھینپ

مٹانے کے لئے بولا ۔

"تم بھی پڑھا لکھا کرو ۔

"ہل آپ سے نہیں چلے گا حضور ۔ بڑی محنت کا کام ہے یہ مالک "

"تم جانتے ہو ہم کون ہیں ـــ ؟" جیون نے یونہی بغیر سوچے سمجھے یہ سوال کر دیا ۔

"آپ بڑے آدمی ہیں سرکار ۔ اور ہم دیہاتی لاکھ ان پڑھ اور جاہل ہونے کے بعد بھی ہر بڑے آدمی کو دیکھ کر دور سے پہچان لیتے ہیں ۔

"یہ گاؤں کس کا ہے ؟"

"خلیق اللہ خانصاحب کا گاؤں ہے یہ مالک "

درختوں کے سائے لمبے ہو چکے تھے ۔ اور سورج کی کرنوں میں سنہرا رنگ جھلکنے لگا تھا ۔ کہ یکبارگی جیون کو اپنی کھوج کا خیال آیا ۔ اسے ابھی تک ناگ دیوتا کی داسی کا پتہ نہیں چلا تھا ۔ اس نے اضطراب کے عالم میں بنسری بجانے والے نوجوان کی طرف دیکھ کر پانچ روپیہ کا ایک نوٹ پھینکا ۔

"لو یہ تمہارا انعام "

اور پھر وہ بغیر کسی بات کا مزید انتظار کئے ہوئے اپنے گھوڑے کی لگام موڑ کر روانہ ہو گیا ۔ اس نے ایک ہلکی سی ایڑ لگائی اور اس کا گھوڑا فراٹے بھرنے لگا ۔ اس کے خوبصورت بال ہوا سے اُڑ رہے تھے ۔ اس کے کان بڑے حسین انداز میں اوپر کو کھڑے ہوئے تھے ۔ اور گر رہے تھے ۔ اس کی گردن ہنس کی طرح کھڑی ہوئی تھی اور اس کا فراخ سینہ پھولا ہوا تھا ۔

"کہاں جاؤں ۔ کدھر تلاش کروں اُسے "

بڑے دکھ سے جیون نے جیسے یہ سوال اپنے دل سے کیا ہو۔ اور وہ نظریں گھما کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ چھوٹے چھوٹے گلیاروں اور راستوں پر سے ریوڑ گزر رہے تھے اور کسان اپنی اپنی گردنیں اٹھائے اپنے کھیتوں کے بیچ سے کھیتوں کا نذرانا چھوڑ کر اسے دیکھنے لگے تھے۔

ایک جگہ کیرا چل رہا تھا۔ کنوئیں سے بیل پانی کھینچ رہے تھے۔ اور جیون نے دیکھا کہ اس کی "ناگ والی" پروائی پھیر آرہی ہے۔ یعنی وہ چمڑے کے بڑے سے ڈول کو پکڑنے کے کام میں مصروف ہے۔ جیون نے اپنے گھوڑے کو یکبارگی روکا اور وہ ایک زور کے جھٹکے کے ساتھ کھڑا ہو کر الف ہو گیا۔

جیون نے باگ موڑی اور وہ کنوئیں کے پاس آیا۔ اور جونہی "ناگ والی" کی نظر جیون پر پڑی۔ پھر چمڑے کا ڈول جیسے کہ وہ ہاتھ بڑھا کر پکڑنا چاہ رہی تھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر ایک زور کے جھٹکے کے ساتھ پیری میں آکر واپس کنوئیں میں چلا گیا۔ اور پیری پر سے بیل گھسٹ کر اوپر آگئے۔ انکی گردنیں رسے کی رگڑ سے چھل گئیں۔ اور کیرا ہانکنے والا اوندھے منہ اسی جگہ گر گیا۔ مگر وہ پھر اٹھا سنبھلا اور اس نے بڑی دقت سے بیلوں کو ٹھہرایا۔

پُر اب واپس آچکا تھا۔ اپنے ہوش و حواس جمع کر کے "ناگ والی" نے پر پکڑا۔ اور پانی ایک شور کے ساتھ پیری میں گر کر بل کھاتا ہوا نالیوں سے بہہ کر کھیت دل میں جانے لگا۔

"کیا میں پانی پی سکتا ہوں؟"

جیون نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ یہ سوال کیا۔

"روکا کس نے ہے ؟"

"ناگ داسی !"

دونوں کی نظریں چار ہوئیں اور جیون اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا کہ وہ بولی۔

"میرا نام ناگ داسی نہیں سنجوگ ہے !"

"سنجوگ — !"

جیون کے منہ سے نکلا۔

"بڑا خوبصورت نام ہے !"

سنجوگ گھبرا کر بولی ۔

"پانی پی لیجئے آپ ۔ اور اگر چاہتے تو ہاتھ منہ بھی دھو ڈالئے !"

اور بغیر کچھ کہے سنتے جیون اپنے گھوڑے سے اتر کر جوتوں سمیت پیری میں آگیا

"ارے ! ارے ! !" سنجوگ بولی "جوتے تو اتار دیجئے !"

"اوہ — !" جیون پیری سے باہر نکل کر اپنے جوتے کھولنے لگا ۔

اسکے گھوڑے نے دو قدم آگے بڑھ کر پانی میں اپنا منہ ڈال دیا ۔

"بڑا پیاسا تھا بیچارہ" سنجوگ بولی ۔

"اور میں نہیں — ؟" جیون جوتوں کے بند کھولتا ہوا اسی طرح جھکے جھکے

اس کی طرف دیکھ کر بولا ۔

"تو بجھا لیجئے نہ پیاس ، روک کس کی ہے !"

"ابھی آتا ہوں !"

جیون نے بڑے پیار بھرے انداز میں سنجوگ کو دیکھا ۔ وہ پیری کے اندر آچکا تھا

"کب سے تمہیں ڈھونڈ رہا ہوں۔"

وہ پانی چُلو میں لیکر بھولے سے بولا۔ اور سنجوگ دوسری نوائی "پیری میں ڈالتے ہوئے بولی۔ "آج یہ دائی کرنی تھی مجھے۔"

"رات بھر میں نہیں سویا۔"

اور جیون کی اس بات پہ سنجوگ کے چہرے پہ حیا کی سرخی دوڑ گئی۔ وہ اپنے ہونٹ دانتوں سے دبا کر آہستہ سے بڑبڑائی۔

"اب تم جاؤ — بابا آتے ہوں گے۔"

"پھر —" قدرے جیون رک کر بولا۔

"میں کل اسی جگہ آؤں گا۔"

"کل میں پہاڑی پہ ربوڑ لے کر جاؤنگی۔"

سنجوگ دبی زبان سے بولی۔

"تو میں کل وہاں آؤں گا۔"

"تم جاؤ اب یہاں سے۔"

دوسری نوائی آ گئی تھی۔ اور سنجوگ جیون کی طرف سے غیر متعلق ہو کر رسا پکڑ کر کنوئیں میں جھانکنے لگی۔ کھیرا ہنکانے والا نزدیک آ رہا تھا۔

پیری سے نکل کر جیون نے چرتے ہوئے گھوڑے کی لگام سنبھالی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کا گھوڑا بڑی تیزی کے ساتھ دلکی چلتا ہوا پکی ہوئی فصل کے پیچھے نظروں سے غائب ہو گیا۔

رامو کی آنکھ صبح ساڑھے پانچ بجے اسوقت کھلی جبکہ دودھ والے نے دودھ دینے کے لئے دروازہ پر آہستہ سے دستک دی ۔ وہ اٹھا اور دودھ لیکر وہ دوبارہ سونے کے لئے باورچی خانہ میں جا ہی رہا تھا کہ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کہ اُسکے صاحب جاگ رہے ہیں۔

وہ دبے پاؤں جیون کے کمرے کے پاس آیا۔ اور وہ اپنے صاحب کے سونے یا جاگنے کا اندازہ لگا رہا تھا کہ ذرا سی آہٹ پا کر جیون نے آواز دی ۔

"کون ۔ ! رامو ؟"

"جی صاحب ۔" رامو کمرے کے اندر چلا گیا۔

"آپ جاگ رہے ہیں صاحب ؟"

"ذرا ایک گلاس پانی تو پلاؤ ۔"

اور جب رامو پانی کا گلاس اندر لے کر آیا تو وہ گلاس جیون نے اسکے ہاتھ سے لیتے

ہوئے کہا۔ کتنی مرتبہ تم سے منع کیا رامو کہ ڈرائنگ روم میں یا کسی اور جگہ تم کرسیاں یا کوئی اور چیز ادھر اُدھر نہ پڑی رہنے دیا کرو۔ مگر تم ہو کہ سنتے ہی نہیں ہو۔"

"کیا ہوا صاحب —!" رامو نے گھبرا کر پوچھا۔

"ہوتا کیا! تمہارا سر —" جیون بڑبڑایا۔

"میں پانی پینے اُٹھا تھا کہ بیچ بیچ تمہاری رکھی ہوئی کرسی سے ٹکرایا۔"

"ارے —!" رامو بڑی ندامت اور تکلیف سے بولا۔

"آپ مجھے جگا لیتے صاحب! بیکار کو اُٹھے آپ۔"

اور جب جیون اُسے گلاس واپس دینے لگا تو وہ ہاتھ بڑھا کر گلاس لیتے ہوئے بولا۔

"میں معافی چاہتا ہوں صاحب! غلطی ہوگئی مجھ سے۔ مگر اب کبھی نہ ہوگی۔"

"کوئی بات نہیں۔" جیون نے ملائمیت سے کہا۔

"مگر صاحب —!" رامو نے لجاجت سے کہا۔

"اب کبھی آپ نہ اُٹھیے گا اسطرح۔ میں موجود ہوں کسی دن کام آؤں گا میں آپکے۔"

"اچھا۔ اچھا!! —"

جیون ممنونیت بھرے انداز سے یہ کہتا ہوا اطمینان سے لیٹ گیا۔

"پاؤں دبا دوں صاحب۔"

"نہیں تم جا کر سو رہو۔"

"تھوڑی دیر پاؤں دبا دوں۔" رامو نے جیون کے پاؤں پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"اب کیا سونا۔ صبح تو ہو ہی گئی ہے۔"

رامو پاؤں دباتا رہا۔ اور جیون جو کہ کافی سے زیادہ تھکا ہوا تھا۔ تھوڑی ہی

دیر غفلت کی نیند سو گیا۔

جیون ابھی تک سو ہی رہا تھا اور رامو باورچیخانہ میں تھا۔ کہ اتنے میں شہلا آ گئی۔

"ارے۔! آپ!!"

رامو اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"اچھا کیا آپ نے گھنٹی نہیں بجائی۔ صاحب ساری رات جاگتے رہنے کے بعد ابھی سوئے ہیں۔ کوئی صبح ساڑھے پانچ بجے!"

"کیوں۔!" شہلا نے بڑی بے چینی سے پوچھا۔

"تمہارے صاحب رات بھر سوئے کیوں نہیں۔؟"

"وہ اکثر راتوں کو نہیں سوتے!" رامو نے بڑے درد کے ساتھ کہا۔

"نہ جانے پڑے پڑے کیا سوچا کرتے ہیں۔ ابھی صبح جب میں دودھ لینے کیلئے اٹھا تو دیکھا کہ وہ جاگ رہے ہیں۔ میں دیر تک اُن کے پاؤں دباتا رہا اور وہ سوتے رہے اور جبھی تو میں دروازہ بند کرنا بھول گیا تھا!"

اور پھر وہ شہلا کی طرف دیکھ کر بولا۔

"ارے! آپ تو کھڑی ہیں۔ بیٹھ جایئے نہ چلئے! ڈرائنگ روم میں چلئے!"

وہ باورچیخانہ سے باہر نکلنے لگا۔

"تم میری فکر نہ کرو رامو!" شہلا نے آہستہ سے کہا۔

"بس تمہارے صاحب کیلئے ناشتہ بنانے آئی ہوں اور اب میں روز اسی

وقت آیا کرو گی۔ آج سے اُنکا کھانا بھی میں بناؤنگی "۔

"مگر ـــ" رامو کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"کیوں کیا بات ہے "۔

"شاید صاحب مجھ پر خفا ہوں "۔

"اس کی فکر تم نہ کرو " شہلا نے بڑے یقین کے ساتھ کہا۔

"میں سب ٹھیک کر لوں گی "۔

"کتنی اچھی ہیں آپ "۔

آج کا ناشتہ میں شہلا نے بڑا اہتمام کیا تھا۔ پراٹھے، نمک پارے، کھجوریں، انڈوں کے ٹوسٹ۔ اُبلے ہوئے انڈے سموسے اور نہ جانے کیا کیا۔

حسب معمول کل کی طرح جب آج بھی جیون ناشتہ کی میز پر بیٹھا تو شہلا بھی اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔ وہ ایک ایک پلیٹ آہستہ آہستہ اس کے آگے بڑھاتی جا رہی تھی۔ اور رامو اس کی تیار کی ہوئی ہر چیز کی ترجمانی کرتا جا رہا تھا۔

"صاحب! یہ کھجوریں ہیں ـــ یہ انڈوں کا ٹوسٹ ہے ـــ یہ نمک پارے ہیں ـــ اور صاحب ـــ"

کہ یکبارگی جیون نے اس کی بات کاٹی ـــ

"مگر یہ سب بنایا کس نے ہے ـــ ؟"

"میں نے صاحب " رامو چوروں کی طرح بولا۔ جیسے کہ جیون نے عین موقع پر اسے چوری کرتے ہوئے پکڑ لیا ہو۔

"جھوٹ بولتے ہو تم —"

جیون پورے وثوق کے ساتھ بولا۔

"یہ سب چیزیں تم کبھی تیار نہیں کر سکتے"

اور جیون کے اس قطعی فیصلے پر رامو گھبرا گیا۔ اسکی زبان گنگ ہو گئی۔ وہ سراسیمگی کے عالم میں شہلا کی طرف دیکھنے لگا۔ اور شہلا نے اشاروں میں اسے تسلی دی۔ اور کہا کہ وہ اپنی اسی ایک بات پر اڑا رہے کہ یہ چیزیں میں نے تیار کی ہیں۔

"بولتے کیوں نہیں راموں" جیون نے قدرے ترش روئی سے پوچھا۔

"سچ سچ بتاؤ"

"سچ کہہ رہا ہوں صاحب"

رامو کے لہجے میں لکنت تھی۔

"کہ میں نے — یعنی یہ کہ میں نے خود — میں نے بنائی ہیں"

"جھوٹ بولتے ہو تم"

"جیون بڑی تکلیف کے ساتھ بولا۔

"میں اندھا ہوں دیکھ نہیں سکتا۔ اسلئے تم میرے ساتھ مذاق پر اتر آئے ہو۔ اور یہ کہکر وہ میز پر سے اٹھنے لگا۔ بڑی بیچارگی اور بڑے دکھے ہوئے دل کے ساتھ اور اس کی اس حالت پر شہلا اپنے آپ کو قابو پر نہ رکھ سکی۔ اور عالم

بے اختیاری میں اپنا راز خود فاش کرتے ہوئے گھبراہٹ میں بول اُٹھی۔

"ناشتہ کر لیجئے آپ!"

"کون ---!" جیون رک گیا۔

"جی میں ---!" وہ تھوک نگلنے لگی۔

"میں ہوں --- میں --- یعنی کہ ---"

"شہلا ---!" جیون نے مشکل حل کر دی۔

"جی ---!"

"یہ آپ مجھ سے آنکھ مچولی کیوں کھیل رہی ہیں!"

جیون کی آنکھیں بیقرار تھیں۔

"کیا آپ کو معلوم نہیں کہ میں اندھا ہوں!"

وہ چند لمحے رک کر۔ اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے بولا۔

"اور اندھوں کے ساتھ کوئی آنکھ مچولی نہیں کھیلتا!"

اسکے نتھنے پھڑک رہے تھے۔ اور اس کا گلا رندھ گیا تھا۔

"زندگی کی ایک بہت بڑی بھول کر رہی ہیں آپ۔ بہت بڑی بھول!"

اس نے اپنی گردن جھکا لی۔

"میرے پاس آنکھیں نہیں ہیں۔ دل نہیں ہے میرے پاس۔ کوئی ایسی امنگ نہیں ہے کہ جس کے تقاضوں سے مجبور ہو کر میں اپنی عمر رفتہ کو لوٹا لوں"

اس کی آنکھوں سے آنسو بل پڑے۔

"کیوں آپ ایک سائے کے پیچھے بھاگ رہی ہیں۔ نادان ہیں آپ جو ایک زندہ

لاش کو اپنے کندھوں پر اُٹھانا چاہتی ہیں۔ کتنی بڑی ناسمجھ ہیں۔ آپ جو پھول چننے کی جگہ کانٹوں سے اپنا دامن الجھا رہی ہیں۔ جتنی جاگتی مکھی نہ نگلئے آپ نہیں تو آپ کو تنگ کرنی پڑے گی۔ اور چھینٹوں سے آپکا دامن داغدار ہو جائیگا۔"

شہلا کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے تھے۔ اور ایسی بات جو برسہا برس کے بعد بھی ایک لڑکی کی زبان سے نکل نہیں سکتی۔ اسوقت پڑ جانے پر اس کے ہونٹوں سے پھوٹ نکلتی تھی۔ وہ اپنے آنسوؤں کو اپنے آنچل سے صاف کرتے ہوئے بولی —

"انسان پر ایک ایسا وقت بھی آجاتا ہے۔ کبھی کبھی جبکہ اسکے کان نصیحتوں کی طرف سے بہرے ہو جاتے۔ اور آپ یہ سمجھ لیجئے کہ میرے کان بہرے ہو چکے ہیں اور آپ نے اپنے بارے میں جو بھی کہا ہے۔ آپ کے ضمیر کی آواز ہو سکتی ہے۔ مگر میرے دل کی آواز ہرگز نہیں ہے۔"

اور یہ کہکر شہلا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اور جیون گھبرا گیا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ کہ وہ کیا کرے۔ آخرش وہ بڑی کشمکش کے عالم میں بولا۔

"آخر آپ چاہتی کیا ہیں — ؟"

"آپ کی خدمت —"

وہ جذبات سے بے قابو ہو کر بولی —

"اور اس بات کی اجازت آپ کو دینی ہی ہو گی —

"آپ اپنے ماں باپ کو بڑا دکھ دے رہی ہیں۔ ایشور کے لئے ان بیچاروں کی آشاؤں پر ترس کھائیے۔ آپ کو شاید معلوم نہیں کہ بیچارے ماں باپ اپنی بیٹی کے جیون کے کتنے سندر اور کتنے بڑے بڑے سپنے دیکھتے ہیں۔"

"میرے ماں باپ کا سایۂ میرے سر پر نہیں ہے اور میری دیدی کے سپنے وہی ہیں۔ جو میری خوشی ہو۔ جو میری چاہت ہو"

"آپ بھی ناداں معلوم ہوتی ہیں۔ بالکل اس بچے کی طرح جو انگار سے کھیلنا چاہتا ہے اور جو پتھر کے حقیر ٹکڑے سے اپنے ہونٹ لہولہان کر لینے کی ضد کیا کرتا ہے"

"میں آپ سے نہیں چاہتی۔ صرف یہ چاہتی ہوں کہ آپ مجھے اپنے قریب رہنے کی اجازت دے دیجئے"

"مگر اس سے حاصل ۔۔۔ ؟"

"کچھ نہیں ۔۔۔

"پھر"

"میری خوشی"

"اگر آپ کی خوشی یہی ہے تو آپ اپنی خوشی کے لئے یہاں آ جایا کیجئے۔ مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

"سچ ۔۔۔ !

شہلا خوشی سے دیوانی ہو گئی۔ اور مارے خوشی کے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

اور بڑے متاثر کن انداز میں اس نے یہ شعر زیر لب گنگنایا۔

جو آتا ہے خوشی کی انتہا پر
بہت روئے تھے اس آنسو کی خاطر۔ (محمد علی تاج)

شہلا جب سے جیون کی زندگی میں ایک انجانی بہار بن کر داخل ہوئی تھی اس کی زندگی میں نمایاں انقلاب آگیا تھا۔ جیسے کہ بغیر موسم کی برسات کا ایک ہلکا سا چھینٹا سوکھتی ہوئی کھیتی میں از سر نو زندگی روح پھونک دے یا جیسے کہ بیچ منجدھار میں ڈوبتے ہوئے کسی انسان کو تنکے کا سہارا مل جائے۔

وہ پہلے کی بہ نسبت کسی قدر ہشاش بشاش دکھائی دینے لگا تھا۔ اور اس کی زندگی کے روزمرہ کے معمول میں فرق پیدا ہو گیا تھا۔ شہلا اس کا بے حد خیال رکھتی اس کا دل بہلاتی۔ اس کے لئے بازار سے نت نئے ناول خرید کر لاتی۔ افسانے، ڈرامے اور طنز و مزاح کی کتابیں۔ کئی قسم کے رسالے، اخبارات، اور وہ بڑی محبت، بڑے خلوص اور بڑے چاؤ سے ان چیزوں کو پڑھ کر اسے سناتی۔ کبھی پکنگ کا پروگرام۔ کبھی پارٹی، کبھی سیر، کبھی تفریح۔

وہ اس کے کھانے پینے کا خاص خیال رکھتی۔ اس کے لئے بازار سے نت نئی چیزیں خرید کر لایا کرتی۔ قیمتی کپڑے، پھل، مٹھائیاں اور نہ جانے کیا کیا۔

وہ اس بات کی کوشش کرتی کہ جیون کو کبھی اور کسی وقت بھی اپنے اندھے ہونے کا احساس نہ ہوا۔ اور وہ اپنی اسی ایک کاوش میں دن رات الجھی رہتی۔

اور جیون اکثر تنہائیوں میں سوچا کرتا کہ عورت ایک ایسا فلسفہ ہے جس کا پورے طور پر حل کر لینا انسانی قدرت سے باہر کی بات ہے۔ وہ شہلا کے بارے میں سوچتا اس کی بے لوث اور والہانہ محبت کا خیال اس کے دماغ میں چکر لگانے لگتا۔ اور پھر وہ اپنی پچھلی زندگی پر ایک نظر ڈالتا۔ ایک ایسی بھرپور نظر جو اس کے خیالات کو نہ جانے کہاں کہاں اور کدھر کدھر الجھانے پھرتی ....

جیون کو دیناپور آئے ہوئے ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔ اور اسی ایک ہفتہ میں اس کی زندگی میں جو نمایاں انقلاب آ چکا تھا اس کی خبر اس کے اور سنجوگ کے سوا کسی اور کو نہیں تھی۔ وہ روز کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر بغیر کسی کو ساتھ لئے ہوئے اسی پہاڑی پر آ جاتا۔ جہاں اس کی اور سنجوگ کی ملاقات پہلے پہل ہوئی تھی۔

اور پھر یہیں اسی جگہ وہ دونوں نہ جانے کیا کیا باتیں کیا کرتے تھے۔ جو ختم ہی ہونے میں نہ آتیں۔ کبھی کبھی تو صبح سے شام ہو جاتی اور ان کی باتیں ختم نہ ہوتیں۔ اور پھر سنجوگ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہتی۔

"ارے! سورج اتنی جلدی ڈوب گیا۔"

اور جواب میں جیون ایک سرد آہ کے ساتھ جواب دیتا۔

"نہ جانے آج کل سورج اتنی جلدی کیسے ڈوب جاتا ہے۔"

"اچھا تو اب میں جاتی ہوں۔"

"تھوڑی دیر اور ٹھہر جاؤ۔"

"نہیں ——! وہ بڑے بھولے پن سے کہتی۔

"اگر اور زیادہ دیر رکوں گی تو بابا ماریں گے۔

"تو کیا ہو ——" جیون مسکراتا۔

"میری خاطر آج مار کھا لینا۔"

"یہ اتنی بڑی بات نہیں ہے ——" وہ کہتی

"مگر پھر ہمیشہ کیلئے آنا جو بند ہو جائے گا یہ بڑی بات ہو گی۔

"ہاں! تو یہ سچ مچ بڑے ظلم کی بات ہو جائے گی۔ جیون اپنے گھوڑے کی لگام سنبھالتا۔

"اچھا تو پھر" وہ بڑی حسرت بھری نظروں سے بھوگ کو دیکھتا۔

"من میلا کیوں کرتے ہو" وہ بڑی معصومیت سے کہتی۔

"کل کیا سورج نہ نکلے گا"

"آؤ گی ضرور نہ"

"ہاں ——"

"تو سچ ——"

"سچ ـــ"

"بھولوگی تو نہیں ـــ؟"

"تم نہیں بھولو گے"

"میں کیسے بھول سکتا ہوں"

"تو میں بھی نہیں بھولوں گی"

دونوں مسکرا دیتے۔ اور جیون اپنے گھوڑے پر بیٹھ جاتا۔

"تو جاؤں ـــ"

"میں کیسے کہوں ـــ؟"

"تو نہ جاؤں ـــ"

وہ گھوڑے پر سے اترنے لگتا۔ کہ سنجوگ بڑھ کر گھوڑے کی پشت پر ایک قمچی مارتی۔ اور وہ تلملا کر دولتیاں جھاڑتا ہوا بھاگتا۔

"کل"

جیون جاتے ہوئے پیچھے مڑ کر دیکھتا۔ اور سنجوگ اپنی آنکھوں میں آنسو بھر کر اثبات میں صرف اپنی گردن ہلا دیتی۔ جیون چلا جاتا اور وہ پہاڑی کے سرے پر کھڑی اسے حسرت بھری نظروں سے اس وقت تک دیکھتی رہتی جب تک کہ راستے کا غبار چھٹ کر صاف نہ ہو جاتا۔

وہ دیکھتی دور دور تک کچھ دکھائی نہیں دے رہا اور اندھیرا چاروں طرف پھیل چکا ہے۔ اب پھر وہ ایک ٹھنڈا سا نس بھر کر پہاڑی سے نیچے اترنے لگتی۔ اور بادل نخواستہ اپنے گھر کو جاتے ہوئے اس ٹیکرے پر بیٹھی جہاں جگنے دونوں

طرف اٹھی ہوئی کھائی پر ناگ پھنی اور سرپت کے جھنڈ اُگے ہوئے تھے۔

وہ آگے بڑھتی جاتی اور اس کا من پیچھے کی طرف بھاگتا جاتا۔ دور اس پہاڑی پر جہاں وہ اب سے کچھ دیر پہلے شانت تھا۔ بالکل مطمئن جسے نہ مستقبل کی پرواہ تھی اور نہ حال کی فکر۔

وہ بیقرار ہو کر اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے سینے کو بھینچ لیتی۔ اور اس کی آنکھوں سے گرم گرم آنسوؤں کے قطرے نکل نکل کر راستہ کے غبار میں جذب ہونے لگتے۔ اور وہ زیر لب بڑبڑائی۔

"الیشورِ ـــ کیا ہو گیا ہے مجھے۔ کیوں میرا من شانت نہیں ہوتا؟"

اور پھر وہ بڑی بے چینی کے ساتھ تیز تیز قدم بڑھانے لگتی۔ جیسے کہ وہ اس دکھ بھرے راستے کو جلد سے جلد پار کر لینا چاہتی ہو۔

جیون کے وائلن سے ایک درد انگیز نغمہ نکل رہا تھا اور ساری فضا اس نغمے کے زیر اثر سوگوار ہو گئی تھی کہ مچلا آگیا۔ اس نے کمرے کے باہر کھڑے ہو کر دیکھا اس کا بھائی بڑی محویت کے عالم میں مشرق کی جانب کھلنے والی کھڑکی کے قریب کھڑا ہوا

دنیا و مافیہا سے بے نیاز اپنی دھن میں گھویا ہوا تھا۔
وہ کمرے کے اندر آگئی۔ اور جیون کو کوئی خبر نہ ہوئی۔ کوئی احساس نہ ہوا اسے وہ اسی طرح بے نیاز تھا۔ اور وائلن کے تار تھرتھرا رہے تھے۔ بملا کا دل اس کے سینے میں زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اور وہ خود نہ جانے کس دنیا میں کھو گئی۔ کہ یکبارگی وہ بے چین ہو کر چیخ پڑی ـــ

"بھیا ـــ"

اور اس کے اسقدر بے چین ہو کر چیخ پڑنے سے جیون چونک پڑا اس کا ہاتھ خود بخود رک گیا۔ اور نغمے کی گونج یکبارگی فضاؤں میں تھرتھرا کر خاموش ہو گئی۔

"کیا ہوا بملا ـــ ؟"

جیون وائلن میز پر رکھ کر اس کی طرف لپکا۔

"بھیا ـــ!" وہ ایک شکست خوردہ انداز میں اپنے تیز سانسوں کے درمیان بولی
"اتنے درد ناک نغمے نہ انڈیلا کیجئے۔ دل بھر آتا ہے۔ آنکھوں میں آنسو امڈ آتے ہیں۔"

"بڑی حساس ہو تم"

"میں تو پھر بھی انسان ہوں"

بملا حد سے زیادہ سنجیدہ ہو گئی۔

"آپ کے ان نغموں نے تو فضاؤں کے سینے کو بھی چاک کر دیا ہے"

اس نے جیون کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

"کیا ملتا ہے آپ کو ان باتوں سے ؟"

"زندگی کیلئے غم بھی تو ضروری ہے بملا" جیون جذبات کی رو میں بہہ گیا۔
"جیسے کہ اجالے کے ساتھ تاریکی۔ اور آسمان پر مسکراتے ہوئے چاند کے بعد گھپ اندھیرا"

"آپ تو کویوں کی سی باتیں کرنے لگے"

"مگر کویوں کی کہی ہوئی تمام باتیں یکدم سے جھوٹی تو نہیں ہوتیں" جیون بملا کے قریب سے ہٹ کر کھڑکی کے نزدیک آ گیا۔

"یہی تو دراصل قدرت کا نتیجہ ہوتا ہے بملا"

اس نے گھوم کر بملا کو دیکھا۔

"کیا تم نہیں جانتی ہو اس حقیقت کو"

"کبھی حقیقتوں سے جان بوجھ کر چشم پوشی بھی تو کی جاتی ہے"

"تم تو اس وقت حقیقت سے چشم پوشی پر آمادہ ہو"

جیون نے حد سے بڑھی ہوئی سنجیدگی کو ختم کرنا چاہا۔

"کیوں ہے نہ یہی بات ۔۔۔؟"

اس کو بملا کے نزدیک آکر اس کی اس کی ٹھوڑی کو اوپر اٹھاتے ہوئے اس کی نظروں میں نظریں الجھا دیں۔

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ میری بہن اتنی حساس ہے"

بملا کوئی جواب نہ دیکر وہاں سے ہٹ کر میز کے قریب آگئی اور جیون کیطرف دیکھ کر بولی۔

"یہ آخر آپ روز بغیر میرے چلے کہاں جاتے ہیں ۔۔۔؟"

"کہیں تو نہیں" جیون نے ایسی انداز سے جواب دیا۔ جیسے کہ اس کی بہن نے اس کی چوری پکڑ لی ہو۔

"کہیں جاتے تو ضرور ہیں آپ"

"یونہی اِدھر اُدھر پھرنے" جیون نے اپنی نظریں کھڑکی سے باہر دور کھیتوں پہ ڈال دیں۔

"مجھے دراصل یہ ماحول بے حد بھا گیا ہے"

"تو اب آپ گھر واپس کب چلیں گے"

"کیوں ـــ !"

"میرا جی گھبرا گیا ہے اب یہاں سے"

"جب تم کہو"

"میں تو چاہتی ہوں کہ آج ہی آپ چلئے یہاں سے"

"ارے ! اتنی جلدی ہی"

بملا کے اس کہنے کے ساتھ ہی جیون چونک پڑا۔ اور وہ پھر بڑی لجاجت سے بولا۔

"آج نہیں ۔ کل ۔ کیوں ہے نہ بملی" ؟

جیسے کہ وہ بملا سے درخواست کر رہا ہو کہ اسکی یہ بات تو یقینی طور پر مان لیجائے اور بملا نے مسکراتی ہوئی آنکھوں سے اپنے بھائی کی طرف دیکھ کر کہا۔

"اچھا کل ہی ۔ مگر کل ہم ضرور واپس چلیں گے"

جیون یکبارگی تو خوش ہو گیا۔ جیسے کسی اسکول کے بچے کو یہ خبر مل گئی ہو کہ

کل اسکول میں چھٹی ہے۔

"ہاں! کل ضرور واپس چلیں گے"

"مگر یہ نہیں کہ" بملا مسکرائی۔

(کل کبھی نہیں ہوتی)

"نہیں ایسا ہرگز نہیں ہوگا" جیون یکبارگی بول پڑا۔

اور پھر اس نے بملا کے سر پر ایک ہلکی سی چپت لگائی۔

"پگلی۔! مجھے بناتی ہو"

نہ جیون نے سنجوگ کو یہ بتایا تھا کہ وہ کون ہے اور نہ سنجوگ نے جیون پر یہ بات ظاہر ہونے دی تھی کہ وہ کس کی بیٹی ہے۔ اور اس کے باپ کا کیا نام ہے اور وہ کس گاؤں میں رہتی ہے۔ اور اگر سچ پوچھا جائے تو ان دونوں کو ایک دوسرے کے بارے میں جاننے کی ضرورت ہی نہ پیش آئی تھی۔ نہ تو ان کے پاس ان فضول باتوں کے لئے فالتو وقت تھا اور نہ کبھی ایسا موضوع ہی نکلا سنجوگ جیون کو ہمیشہ شکاری کہہ کر پکارتی اور جیون صرف یہ جانتا کہ وہ "ناگ دیوی" سے محبت کر رہا ہے۔ اس ناگ دیوی سے جو جنگل کی شہزادی ہے۔ اور اس کے دل کی ملکہ اور بس!

کل جیون کو دینا پور سے واپس ہمیر پور جانا تھا۔ اور آج ابھی تک سنجوگ نہیں آئی تھی۔ وہ بڑی بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اور آج تو وہ بڑی مشکلوں سے تنہا یہاں تک آ پایا تھا۔ بملا کی ضد تھی کہ وہ بھی تفریح کیلئے

جیون کے ساتھ جائے گی - اور جیون اسے بہلا پھسلا کر سمجھا بجھا کر بڑی نزکیبوں اور بڑی منتوں کے بعد اپنے ساتھ آنے سے روک سکا تھا۔

اور سنجوگ ابھی تک نہ آئی تھی - اور وہ اس انتظار کر رہا تھا۔ انتظار کی گھڑیاں کتنی صبر آزما ہوتی ہیں یہ بات جیون کو آج اسلئے معلوم ہوئی تھی کہ سنجوگ کے انتظار کے یہ ڈیڑھ گھنٹے اس نے اس انداز میں گزارے تھے جیسے کہ ڈیڑھ سو برس گذر گئے ہوں۔

آخر وہ تنگ آ کر محض دل بہلانے کی خاطر ایک درخت کی جھکی ہوئی شاخ پہ لیٹ گیا۔ اسکے لب خود بخود وا ہوئے۔ اور وہ محویت کے عالم میں ایک غزل گنگنانے لگا - اور پھر اس کی یہی گنگناہٹ اونچی آواز میں گانا بن گئی۔

وہ گا رہا تھا۔

وعدہ اس ماہرو کے آنے کا	یہ نصیبہ سیاہ خانے کا
ذرے ذرے میں بیتاب ہیں وہ	جنکو دعوی ہے منہ چھپانے کا
حاصل عمر ہے شباب مگر	اک یہی وقت ہے گنوانے کا
رہ گئے بن کے ہم سراپا غم	یہ نتیجہ ہے دل لگانے کا
اس بدلی ہوئی نظر کو یہ	یوں بدلتا ہے رخ زمانے کا
چاندنی ، خاموشی اور آخر شب	آکہ ہے وقت دل میں آنے کا

(اختر شیرانی)

غزل ختم ہو گئی۔ اسکی آواز فضاؤں میں تحلیل ہو گئی۔ مگر اس کے دل کا سوز نہ تھما۔ اسکی بےچینیاں ختم نہ ہوئیں اور وہ اسطرح بے سدھ درخت کی جھکی ہوئی شاخ پر

آنکھیں بند کئے لیٹا رہا۔ کہ اس کے کان میں سرسراہٹ ہوئی۔ اس نے یونہی اپنے داہنے ہاتھ کی انگلیوں سے اپنے کان کو جھاڑا۔ پھر سرسراہٹ ہوئی اس نے پھر اپنے کان پر انگلیاں پھیر آئیں۔

پھر سرسراہٹ ہوئی۔ اور اس بار اس نے چونک کر اپنی آنکھیں کھول دیں۔ گھوم کر لیٹے ہی لیٹے اس نے پیچھے کی جانب دیکھا اور یکدم گھبرا کر اُٹھنے کی کوشش میں دھڑام سے نیچے آ رہا۔

کوئی کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ اور وہ اپنے کپڑوں کو جھاڑتا ہوا اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"لگتے تو بڑا اچھا ہو تم" سنجوگ پورن ماشی کا چاند بن کر اسکے سامنے مسکرا رہی تھی۔

"تم اب آئی ہو — !" جیون جیسے ناراض ہو گیا۔

"ہماری لاچاریاں بھی سمجھتے ہو!" سنجوگ منہ بنا کر بولی۔

"جانتے ہو کتنی مشکلوں سے آپائی ہوں"

"کیا مجبوری تھی —"

"بابا کو جیسے شک ہو گیا۔ یکدم سے حکم سنا دیا۔

دیکھ ری چھوکری خبردار جو آج سے اس پہاڑی پہ گئی"

"پھر — !"

جیون مضطرب ہو کر بولا۔

"پھر کیا — مصیبت آ گئی!"

"پھر تم آئیں کیسے"

"بابا کو چکما دیکر۔ میں نے کہا دیوتا میرا انتظار کر رہے ہوں گے"

"دیوتا ——!"

"ہاں ناگ دیوتا۔ انہیں کا بہانہ بنا کر تو آئی ہوں۔ یہ دیکھو نہ دودھ کا لوٹا۔ میرے ہاتھ میں ہے۔"

اور پھر وہ لوٹا جیون کے منہ کے پاس لیجا کر بولی۔

"اچھا لو! پی تو لو یہ دودھ۔ بڑا میٹھا ہے۔ اور اسے میں نے اپنے ہاتھ سے دوہا ہے۔"

"مگر ناگ دیوتا —! اگر وہ روٹھ گئے تو ——؟"

"تم نہ روٹھو مجھ سے۔" اس نے بڑے پیار سے جیون کی طرف دیکھ کر اپنی نظریں جھکا لیں۔

"چاہے کوئی، روٹھ جائے۔ اب میں کسی کی پرواہ نہیں کرتی۔"

"اوہ ——!"

بیقرار ہو کر جیون نے سنجوگ کو اپنی مضبوط باہوں میں جکڑ لیا۔ اور وہ تڑپتے ہوئے بولی۔

"نہ —نہ۔ نہ۔ یہ سب کچھ نہیں۔ چھوڑ دو مجھے۔"

اور جیون نے جیسے خود سے لٹ پا کر اسے چھوڑ دیا۔

"شما کرنا — بھول ہو گئی۔"

اور سنجوگ نے اسے کنکھیوں سے دیکھا۔

"بھول کرتے ہی کیوں ہو۔ جو شما مانگنی پڑے۔"

اس کا سانس تیز تیز چل رہا تھا۔ اور وہ اپنے پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کرید رہی تھی۔

"میں کل جا رہا ہوں"

گھبرا کر اس نے اپنی نظریں اوپر اٹھائیں۔

"کہاں — ؟

"اپنے گھر —"

"پھر —!" وہ بیقرار ہو کر بولی۔

"پھر نہ آؤ گے — ؟"

"ضرور آؤں گا —"

"کب — ؟"

"پرسوں — اور پھر اس کے بعد روز"

"دیکھو آنا ضرور — نہیں تو —"

اور "نہیں تو" کے بعد وہ رک گئی۔

"نہیں تو کیا — ؟" بڑے اشتیاق بھرے لہجے میں جیون نے پوچھا۔

"میں پاگل ہو جاؤں گی"

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"اور میرا جی ڈوب جائے گا۔ اور پھر —"

وہ نظریں اِدھر اُدھر دوڑا کر بولی۔

"یہ سب مجھے کاٹ کھانے کو دوڑے گا"

"میں ضرور آؤں گا"

"تمہاری جو ٹھہرے تم۔ کیا پتہ کسی اور طرف نکل جاؤ"

"شکاری تھا کبھی پہلے۔ مگر اب نہیں ہوں۔"

"اب کیا ہو ——؟"

"شکار ——!"

وہ سنجوگ کی آنکھوں کی گہرائیوں میں اتر کر بولا۔

"تمہاری ان مدھ بھری آنکھوں کا شکار۔"

"میری گجری کا دودھ ہے یہ۔ پی لو اسے۔"

وہ جیون کی آنکھوں کی کشش سے آنکھیں چراتے ہوئے بولی۔

"گجری میری بڑی پیاری گئے ہے۔"

"اچھا ——!"

"ہوں ——! گاؤں بھر میں وہ سب سے زیادہ دودھ دیتی ہے۔"

اور جیون دودھ پی گیا۔

"سچ مچ بڑا میٹھا دودھ ہے یہ تو۔"

"میں نے کہا تھا نہ۔ پیو گے تو پتہ لگے گا۔"

"سچ کہا تھا تم نے۔"

"اچھا تو اب میں جاؤں ——؟"

"اتنی جلدی ——!"

"بابا غصہ ہوں گے۔"

"پھر ——!"

جیون بے چین ہو گیا۔

"پھر — !"

سنجوگ نے اس انداز سے "پھر" کہا کہ جیون تڑپ گیا۔ دنیا جہاں کی مایوسیاں اور مجبوریاں اس ایک لفظ "پھر" کے اندر جذب تھیں۔

"اچھا تو تم جاؤ —"

اور وہ پاؤں کے انگوٹھے سے زمین پر نشانات بنا رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے کئی قطرے زمین پر گرے اور جذب ہو گئے۔ جیون کا دل اس کے پہلو میں ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپنے لگا۔

اس نے آگے بڑھ کر سنجوگ کی آنکھوں کے تمام آنسوؤں کو اپنے رومال میں جذب کر لیا۔

"مت رو۔ نہیں تو دھرتی کا سینہ پھٹ جائے گا۔"

وہ تو خود رو پڑا۔ اسکی آنکھیں آنسوؤں کے بوجھ سے جھک گئیں۔

"مت رو — ایشور کے لئے۔"

اس نے پریشان ہو کر اپنی اوڑھنی کے آنچل سے جیون کے آنسو خشک کئے۔

"نہیں میری سوگند۔ جو اب تم روؤ۔ میرا ہی مرا منہ دیکھو۔"

اور جیون نے بیقرار ہو کر اسکے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"میرے تمہارے دشمن۔"

"اچھا تو ہنسو۔"

"تم بھی ہنسو — !"

اور وہ دونوں ایک دوسرے کی خوشی کی خاطر مسکرائے۔ دونوں کی روتی

ہوئی آنکھوں کے پیچھے سے مسکراہٹ جھانک رہی تھی۔ پلکوں میں آنسوؤں کے پھنسے ہوئے قطرے گالوں پر لڑھک آئے۔

اور اب ان دونوں کی آنکھیں صاف طور پر مسکرا رہی تھیں۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو مسکراتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ایسی نظروں سے جن میں محبتیں کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی ہوں۔

"اچھا تو اب میں جا رہی ہوں"۔

اس نے جیون پر ایک بھرپور نظر ڈال کر اپنی آنکھیں نیچے جھکا لیں۔

"تو جاؤں نا ——"؟

"جاؤ —— !"

اور وہ مری ہوئی چال کے ساتھ واپس جانے لگی۔ جیون اسی جگہ بت بنا کھڑا رہا۔ وہ اسے بڑی اپنی حسرت بھری نظروں سے جاتا ہوا دیکھ رہا تھا کہ یکبارگی وہ رک گئی۔

اس نے پیچھے گھوم کر دیکھا۔

"دیکھو آنا ضرور —— میں تمہاری راہ تکوں گی"!!

"ضرور آؤں گا"۔

وہ جانے لگی —— وہ آگے بڑھتی گئی —— اور جیون نے اسے پہاڑی پر سے اترتے دیکھا —— وہ پہاڑی کے سرے پر آ گیا تھا۔

اور اب اس نے اپنی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے دیکھا کہ بنجک بڑی آہستہ خرامی کے ساتھ چلی جا رہی ہے۔ دور بہت دور —— اس کی نظروں

سے پرے ـــ

اسکا گھاگرا ہوا سے ہل رہا تھا۔ اور اس کی شوخ رنگ کی چنری کے تمام رنگ سورج کی شعاعوں میں چمک رہے تھے۔ وہ دیکھتا رہا دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ دور جا کر گڑیا سی معلوم ہونے لگی۔ ایک ایسی کٹھ پتلی جس کی ڈوری اس کے بابا کی انگلیوں سے بندھی ہوئی تھی۔

وہ دل پکڑ کر بیٹھ گیا۔

اور جب اس نے اپنی نظریں اوپر اٹھائیں ـــ تو وہاں سے دور اس گلیارے میں اسے کچھ بھی نظر نہ آیا ـــ ماسوا دھول گرد و غبار کے۔ اور کچھ نہیں ـــ کچھ بھی تو نہیں۔

گھر پہنچ کر معلوم ہوا کہ رائے بہادر صاحب کی طبیعت خراب ہے۔ آج تین دن سے وہ بیمار تھے۔ ویدجی کا علاج ہو رہا تھا۔

"غضب کر دیا آپ نے پاپا ــــ"

جیون نے اپنے باپ سے شکایت کی۔

"آپ نے اپنی بیماری کی اطلاع کیوں نہیں دی ہمیں ــــ؟"

"ایسا بیمار بھی کہاں تھا میں"

رائے بہادر صاحب نے بیٹے کی پریشانی دور کرتے ہوئے کہا۔

"معمولی بخار ہے۔ ویدجی کی دوا سے آرام آجائے گا"

"ویدجی کی دوا ــــ! ہونہہ ــــ؟"

بملا نے منہ بنایا۔

"زمانہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا اور آپ ابھی تک ویدوں ہی پر بھروسہ کئے

بیٹھے ہیں۔"

"میری بیٹیا ——!"

رائے بہادر صاحب نے بڑے پیار سے اپنی بیٹی کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"گھبرا گئی میری ذرا سی بیماری پر۔ ارے پگلی تو کیا جانے ان ویدوں کو۔"

"سب جانتی ہوں۔" اس نے بیزاری سے کہا۔ اور پھر اپنے بھائی کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔

"بھیا —! آپ تو کسی ڈاکٹر کو بلائیے۔ اچھے سے ڈاکٹر کو۔"

"ارے پگلی یہ قصبہ ہے۔" رائے صاحب مسکرائے۔

"یہاں اچھے ڈاکٹر کہاں۔"

"تو شہر گوف دور ہے ہمارے لئے۔"

جیون اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"میں ابھی کسی آدمی کو گاڑی دیکر شہر بھیجتا ہوں۔ ڈاکٹر کے آنے کی دیر ہے ایک ہی دوا انجکشن میں ساری تکلیف جاتی رہے گی۔"

"ہاں بھیا۔ ضرور۔۔"

رائے بہادر صاحب روکتے ہی رہ گئے۔ اور جیون نے خشکریم کو ایک خط دے کر شہر روانہ کر دیا۔

"جانتے ہیں آپ پاپا کہ آپ کے سوا دنیا میں ہمارا کوئی نہیں ہے اور پھر بھی آپ اپنی صحت کی طرف سے اس قدر غافل رہتے ہیں۔"

جیون نے اپنے باپ سے شکایتاً کہا۔
"آج کتنے دن ہو گئے۔ آپ بیمار ہوئے۔ اور ہمیں اطلاع بھی نہ کرائی!"
"ارے بیٹے ۔ !"
رائے بہادر صاحب اپنے کی اس محبت پر پھولے نہ سمائے۔
"ایسا بیمار بھی کہاں ہوں ہیں۔ اور پھر میں نے سوچا۔ تم لوگ وہاں تفریح کا شکار ہیں لگے ہونگے۔ کاہے کو خواہ مخواہ کے لیے میں اپنی ذرا سی بیماری کی وجہ سے تم لوگوں کے رنگ میں بھنگ کروں۔"
بملا چہک کر بولی۔
"واہ! یہ رنگ میں بھنگ کرنے والی بات بھی خوب رہی۔"
اور پھر وہ اپنے باپ سے لپٹ گئی۔
"سچ پاپا، آپکی اس بات سے مجھے اور بھیا دونوں کو بڑا دکھ ہوا ہے۔"
"ارے! ارے!!" رائے بہادر صاحب مسکرائے۔
"اس میں دکھ کی کیا بات ہے ۔۔۔!"
اور پھر وہ بڑے پیار سے کہنے لگے
"اچھا بابا۔ میں اس دکھ کے لئے تم دونوں بھائی بہنوں سے شما مانگتا ہوں"
"پاپا ۔۔۔!" بملا نے دوبارہ اپنے باپ کو بھینچ لیا۔
"ایشور آپ کو ہم لوگوں کے سر پر سدا جیتا رکھے۔"
"میری بیٹی ۔۔۔!"
رائے بہادر صاحب نے ایک ہاتھ سے بملا کو تھپتھپا دیے۔ اپنا دوسرا ہاتھ جیون

کی طرف بڑھا دیا۔ اور جیون ان سے لپٹ گیا اور وہ دونوں کو اپنے کلیجے سے لپٹاتے ہوئے آبدیدہ ہو گئے۔

"میرے بچو ـــــ! ایشور تم دونوں کو جیتا رکھے۔ سدا سکھی رہو۔ اور تمہاری دلی آرزوئیں ہمیشہ پوری ہوتی رہیں۔"

وہ اپنے دونوں جوان بچوں کو بالکل دودھ پیتے بچوں کی طرح اپنے کلیجے سے چمٹائے رہے۔ اور ایک باپ کی اس محبت پہ کائنات کا ذرہ ذرہ مسکرا اٹھا۔ اور قدرت کا سر فخر و انبساط کے ساتھ اوپر اٹھ گیا۔

ڈاکٹر نے رائے بہادر صاحب کو دیکھا کئی انجکشن دیئے۔ اور ان کی صحت کی طرف سے اطمینان دلاتے ہوئے اس بات کا اظہار بھی ضروری سمجھا کہ یہ جا جی کا یہ حملہ بالکل ہی نظر انداز کر دینے کے قابل قطعاً نہیں ہے۔

اور پھر وہ دو کر دن اپنے دل کے لاکھ تقاضوں کے باوجود جیون حسب وعدہ سنجوگ سے ملنے نہ جا سکا۔ اسکا دل لاکھ تڑپا۔ وہ رہ رہ کر بے چین ہوتا رہا مگر باپ کی بے پناہ محبت کے سامنے محبوب کی کشش کو اپنی ہار مان لینی پڑی۔

جیون ان بیٹوں میں سے ایک تھا۔ جو اپنے ماں باپ کے لئے اپنا سب قربان کر دیتے ہیں۔ جو ہر خوشی۔ ہر آرزو اور ہر تمنائیں۔

اور اپنے باپ کی اسی بیماری کی تگ و دو میں وہ مسلسل کئی دنوں تک اپنے دل کی اس سب سے بڑی خواہش کو پورا نہ کر سکا۔ وہ مجبور تھا۔ جید مجبور۔۔۔ وہ سنجوگ سے مل نہ سکا۔ اور سنجوگ اس کی یادوں میں کھوئی رہی۔ وہ حسب معمول روز اس پہاڑی پہ آتی اور اپنے شکاری کے انتظار میں زخمی پرند کی طرح پھڑپھڑایا کرتی۔ وہ بےچین ہو کر اِدھر اُدھر دیکھتی۔ دور راستوں اور پگڈنڈیوں پر اپنی آنکھیں لگائے بیٹھی رہتی۔ اور ٹھنڈی آہیں بھرا کرتی۔ یہاں تک کہ اس کی نظریں پتھرا جاتیں۔ اس کا پھول جیسا چہرہ کملا جاتا۔ اور اس کا دل اس کے پہلو میں اتنی زور زور سے دھڑکتا کہ وہ اپنے دل کی اس مسلسل اور لگاتار دھڑکن اور بے چینی کی تاب نہ لا کر نیم بیہوش ہی ہو جاتی۔

اس کی خوبصورت اور کنول جیسی آنکھیں آپ ہی آپ آنسوؤں سے بھر جاتیں اور وہ اپنی انہیں ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے راستوں کو تکتی رہتی۔ مسلسل تکے جاتی بغیر پلک جھپکائے ہوئے۔

اسکے نازک لبوں پہ تھرتھری پیدا ہو جاتی۔ اور وہ اُنہیں اپنے دانتوں سے کاٹ لیتی۔ وہ مضطرب ہو کر پہاڑی پر سے نیچے اتر جاتی اور دور تک اس سمت کو بھاگتی جاتی جس طرف سے کہ اس کا محبوب اپنے سفید گھوڑے پر سوار ہو کر نہ جانے کہاں سے چل کر اس کے لئے آیا کرتا تھا۔

اور پھر وہ تھک کر ہانپنے لگتی۔ اور ہار کر مری ہوئی چال کے ساتھ پھر اسی جگہ واپس آ جاتی۔ اسی جگہ۔ اسی پہاڑی پہ جہاں اس کے ناگ دیوتا رہتے تھے۔ اور جہاں پہلی بار ایک ہونی نے اسے شکاری سے ملا دیا تھا۔

وہ گھنٹوں بیٹھی سوچا کرے ۔ کہاں ہو گا اس کا شکاری ۔ کہاں کھو گیا وہ ۔ کدھر چلا گیا اور پھر وہ بےچین ہو کر سورج دیوتا کو دیکھتی ۔ اس سے اپنے محبوب کا پتہ پوچھتی ۔ جیسے کہ وہ اُس سے پوچھ رہی ہو ۔ تم ہی بتاؤ نہ سورج دیوتا ۔ کہاں چلا گیا میرا محبوب کہاں ہے وہ کن راستوں میں کھو کر وہ مجھے بھول گیا ۔ تم تو اسے بھی دیکھتے ہو گے ۔ کیوں میرا پیام اس تک نہیں پہنچا دیتے ۔ کیوں نہیں کہتے اس سے کہ تیری یاد میں کوئی ابھاگن تڑپ رہی ہے ۔ اس کا دل بےچین ہے ۔ تیرے لئے ۔ اور اس کی آنکھیں تیرے انتظار میں راہوں پر لگے لگے پتھرا گئیں ہیں ۔

اسکا دل اس کے غموں کے بوجھ تلے دب کر خون ہو گیا ہے اور اس کے ہونٹوں پر آہوں کی پپڑیاں جم گئی ہیں ۔ تیرے انتظار میں اس کا تن پھونک رہا ہے اور وہ بدنصیب اپنے جی سے گزرتی جا رہی ہے ۔

اور پھر جب دن ڈھل جاتا اور شام ہونے لگتی اور اس کے سورج دیوتا بھی اس کی فریاد نہ سن کر پچھم میں اپنا منہ چھپا لیتے تو وہ بالکل ہی مایوس ہو جاتی اور اپنے دونوں ہاتھوں کے بیچ اپنا منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ۔ روتی خوب روتی ۔ اتنا روتی کہ اس کی آنکھیں سوج جاتیں ۔ آنکھوں کے پپوٹے سرخ ہو جاتے اور وہ روتے روتے بےحال ہو جاتی ۔

اور جب تاریکی اور زیادہ گہری ہونے لگتی تو وہ ایک پژمردہ دل اور تھکے ہوئے مسافر کی طرح جسے اپنی منزل کا پتہ خود نا معلوم ہو ۔ وہاں سے ایک کراہ لیکر اٹھتی اور مری ہوئی چال کے ساتھ اپنے گاؤں کو جاتے ہوئے گلیارے پر ہو لیتی ۔ اس گلیارے پر جس کے دونوں طرف کھائیوں کے اوپر ناگ پھنی اور سرپت کے جھنڈ اُگے ہوئے تھے ۔

دسمبر کی چھٹیاں ختم ہو چکی تھیں اور اب رائے بہادر صاحب کی طبیعت بھی پہلے کی نسبت ٹھیک تھی۔ لہٰذا بملا کالج کے لئے تیار ہو گئی۔ اس کے شہر جانے کے انتظامات ہونے لگے۔

ادھر اُدھر رائے بہادر جیون کے انگلستان جانے کا بھی انتظار کر رہے تھے اس نے یہاں کی تعلیم ختم کر لی تھی۔ اور اب وہ اپنی انجینئرنگ کی تعلیم کے لئے انگلستان جانے والا تھا۔ کاغذات بھیجے جا چکے تھے۔ صرف پاسپورٹ ملنے کی دیر تھی اور وہ بھی آج کل ہی آنے والا تھا۔

بملا شہر چلی گئی اور اس کے جانے کے دوسرے ہی دن جیون کا پاسپورٹ بھی بنگلہ آ گیا۔ اور ساتھ ہی ساتھ THOMES KOOK کا خط بھی بمبئی سے آگیا کہ جہاز فلاں تاریخ کو سیل کر رہا ہے۔ اور اسے اس تاریخ سے ایک دن پہلے بمبئی پہنچ جانا چاہیئے۔

رائے بہادر صاحب کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آ گئے۔ اور جیون خط پاکر یہ سوچنے لگا کہ صرف آج ہی کا دن اس کے پاس ہے اور کل یقینی طور پر اسے شہر چلا جانا ہے۔ جہاں سے وہ بملا کو ساتھ لیکر بمبئی کے لئے روانہ ہو جائیگا۔ اور اگر وہ کل تک یہاں سے روانہ نہ ہُوا تو بمبئی پہنچنے میں اسے دیر ہو جائیگی۔ اور وہاں جہاز سیل کر جائے گا۔ اور پھر دوسرے جہاز کے انتظار میں اسے کم از کم اس سال تو انگلستان کے کسی بھی کالج میں داخلہ ملے گا نہیں۔

لہٰذا وہ بے چین ہو گیا۔ ویسے ہی اسے سنجوگ سے ملے ہوئے پورے سات دن گزر چکے تھے۔ اور ان سات دنوں میں محض اپنے باپ کی بیماری کی وجہ سے وہ اُن سے ایک منٹ کے لئے بھی دور نہ ہو سکا تھا۔ وہ سوچنے لگا نہ جانے اس کے انتظار میں غریب سنجوگ کا کیا حال ہُوا ہو گا اور ویسے بھی ان دونوں میں ہر لمحہ سنجوگ کے لئے تڑپتا اور ترستا رہا ہے۔ ایک پل کو بھی اسکا خیال دل سے جدا نہیں ہو سکا تھا۔

اور اب جو یہ نئی افتاد سامنے آئی تو وہ تلملا گیا۔ اسکا دماغ پریشان ہو گیا اور اس کا دل بڑی بیقراری کے ساتھ سنجوگ کے لئے تڑپا۔

اس نے فیصلہ کر لیا کہ خواہ کچھ بھی ہو۔ وہ آج ہی سنجوگ سے چاہے جیسے بھی ہو ملیگا۔ اور اس سے ملکر اسے بتائے گا کہ وہ صرف ایک سال کے لئے جدا ہو رہا ہے وہ تعلیم کی خاطر سات سمندر پار جا رہا ہے۔ اور پھر ایک سال کے بعد جبکہ وہ وہاں سے واپس آئے گا وہ اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنا لے گا اور پھر دنیا کی کوئی طاقت ان دونوں کو جدا نہ کر سکے گی۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک ہو جائیں گے۔ ایک دوسرے

کے جیون مرن کے ساتھی بنکر وہ اپنی زندگی کے دن ایک ساتھ گذاریں گے۔
اور یہی خیالات لیکر وہ اپنے باپ سے کسی کام کا بہانہ کر کے دیارِ حبیب کی طرف روانہ ہو گیا۔

جیپ کی رفتار چالیس میل تھی۔ اور پھر اس کی رفتار پینتالیس میل فی گھنٹہ ہو گئی۔ اور پھر وہ جیون کے بے چین دل کو لئے پچاس میل کی رفتار سے بھاگنے لگی۔ کچی سڑک پر دو رویہ درختوں کو پیچھے چھوڑتی ہوئی گرد و غبار کا طوفان اُڑاتی اب وہ پچاس میل کی رفتار سے بھی آگے بھاگ رہی تھی۔

جیون چاہتا تھا کہ اس کی گاڑی کے پر لگ جائیں اور وہ آن واحد میں اُڑا کر اسے دیارِ محبوب میں پہنچا دے۔ ایک ایک پل اُس کے لئے بھاری ہو رہا تھا۔ اور ایک ایک لمحہ اس کے لئے قیمتی تھا۔

وہ بڑی تیزی کے ساتھ گاڑی بھگا رہا تھا۔ حادثات اور ٹکراؤ سے بے نیاز ہو کر جیسے کہ اسے اس وقت نہ تو دنیا کی خبر ہو اور نہ مافیہا کی۔

کئی مرتبہ وہ حادثہ کا شکار ہوتے ہوتے رہ گیا۔ اور کئی بار اس کی جیپ درخت سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔ راستہ چلنے والے اس کی اس تیز رفتاری سے عاجز تھے۔ اور وہ اس طول طویل سفر کی طوالت سے نالاں تھا۔

راستہ کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔ جیسے کہ وہ ہزاروں میل کا لمبا سفر ہو حالانکہ اس کی جیپ اب پچپن میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اپنا راستہ طے کر رہی تھی اور اس کے اس سفر کی طوالت زیادہ سے زیادہ پینتیس چھتیس میل کی تھی۔

خدا خدا کر کے سفر کی یہ لمبائی ختم ہوئی۔ اور دور سے پہاڑی دکھائی دینے لگی۔ وہ پہاڑی جو اس کے لئے کوہ طور سے کسی صورت میں بھی کم نہ تھی۔ جہاں اسے اپنے محبوب کا دیدار پہلی مرتبہ ہوا تھا۔ اور جہاں بیٹھ کر وہ اپنے محبوب سے گھنٹوں باتیں کر چکا تھا۔

مارے خوشی کے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور شوق کے بے پایاں جوش میں اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ سنجوگ کی جانی پہچانی ادائیں اس کی آنکھوں میں جھوم اٹھیں۔ اور وہ اس کے تصور میں کھو گیا۔ بیخودی کے عالم میں اسکی آنکھیں بند آنے لگیں۔

پہاڑی کے بالکل قریب پہنچکر جیپ ایک زور کے جھٹکے کیسا تھ رک گئی اور وہ اس سے باہر کود کر بڑی تیزی کے ساتھ پہاڑی پر چڑھنے لگا۔ بلا رکے یا ستائے ہوئے وہ ایک رفتار کے ساتھ پہاڑی پر چڑھ رہا تھا۔

اس کا سانس پھول گیا تھا اور سارے جسم سے پسینہ پھوٹ نکلا تھا۔ مگر کوئی چیز اس کے عزم میں حائل نہ ہو سکی۔ اور اس نے پہاڑی پر چڑھ کر ہی دم لیا۔

اوپر پہنچکر اس نے اپنے گرد و پیش نظر ڈالی۔ مگر اسے کچھ بھی تو دکھائی نہ دیا۔ وہاں سنجوگ نہیں تھی۔ وہاں سنجوگ کا سایہ بھی نہ تھا۔ سنجوگ کا نشان بھی اسے وہاں نہ مل سکا۔

وہ پہاڑی پر ادھر ادھر چاروں طرف مارا مارا پھرا۔ ایک ایک کونہ چھان مارا اس نے مگر وہ اسے نہ ملی جس کی لگن اسے یہاں تک کھینچ لائی تھی —— وہ

چشمہ پر گیا ---- پہاڑی کے اس طرف۔

مگر وہاں بھی کوئی نہ تھا۔ نہ کوئی چرواہا تھا --- اور نہ کسی بنسری کی مدھر تانیں تھیں۔ دو چار بگلے چشمہ کے پانی میں اپنی گردنیں جھکائے جیسے کسی کے سوگ میں کھڑے تھے دور دور تک کسی کا پتہ نہ تھا --- جیسے کہ پورے ماحول کی روح کھینچ لی ہو کسی نے۔

جیون کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا اس کا سر چکرانے لگا۔ اور اس کے جگر سے ایک ٹیس اٹھی۔ ایک ایسی ٹیس جو اپنی المناکیوں پر آپ بیقرار ہو۔ جو جگر کی پھانس بنکر بھی اسکی کربناکیوں پر پریشان ہو۔

اس کے دل میں ایک۔ زور کی ہوک اٹھی۔ اور وہ اپنا دل اپنے دونوں ہاتھوں سے تھام کر بیٹھ گیا۔ آنسوؤں کے گرم گرم قطرے اس کے رخساروں پر سے پھسل پھسل کر اس کے دامن میں جذب ہونے لگے۔

"کہاں ہوگی سنجوگ ---- ؟"

گرم گرم آہوں کے ساتھ یہ الفاظ اسکے دل کی گہرائیوں سے نکل کر باہر آگئے! اور وہ مری ہوئی چال کے ساتھ دوبارہ پہاڑی پر چڑھنے لگا۔

وہ اسی جگہ آیا۔ اسی پہاڑی پر۔ اسی درخت کی جھکی ہوئی شاخ پر وہ بیٹھ گیا۔ اور بڑے یاس کے عالم میں ---- بڑی بے قراری کے ساتھ رویا۔

اور اسکی بھرائی ہوئی آواز کے ساتھ یہ نغمہ یکبارگی پھوٹ پڑا۔

نظر میں تصور میں، دل میں سما کر
مری آرزوں کی دنیا مٹا کر
مجھے راز دار محبت بنا کر

مرے کعبۂ دل کو کیوں ڈھا رہے ہو
مجھے چھوڑ کر تم کہاں جا رہے ہو

وہ وعدے تمہارے کہ میں ہوں تمہارا
تھے اب تک مری زندگی کا سہارا
یہ شانِ تغافل ہے اب کیوں گوارا

کہ وعدوں سے اپنے پھرے جا رہے ہو
مجھے چھوڑ کر تم کہاں جا رہے ہو

یہ ہے آرزو تم کو دل میں بٹھاؤں
زمانے کی نظروں سے تم کو چھپاؤں
یہ حسرت ہے تمہیں قصۂ غم سناؤں

مگر تم سننے سے گھبرا رہے ہو
مجھے چھوڑ کر تم کہاں جا رہے ہو

میں سمجھا ہوا ساتھ کیوں تم نے چھوڑا
محبت سے منہ آہ کیوں تم نے موڑا
مرے شیشۂ دل کو کیوں تم نے توڑا

میں انجان ہوں مجھ سے کترا رہے ہو
مجھے چھوڑ کر تم کہاں جا رہے ہو

(نادل رقیب)

ہنوان اپنی دونوں آنکھیں بند کر کے درخت کی جھکی ہوئی شاخ پر لیٹ گیا۔

وہ بہت دیر لیٹا رہا۔ مگر اس بار کوئی نہ آیا۔ کسی نے اسکے کانوں میں سرسراہٹ نہیں پیدا کی۔ کسی نے اسکے پیچھے کھڑے ہو کر اسکے کانوں کی تعریف نہیں کی۔

اور وہ اپنی دونوں آنکھیں بند کئے ہوئے اسی انتظار میں لیٹا رہا۔ بہت دیر تک لیٹا رہا —— بہت دیر تک —— آخرش وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

وہ پہاڑی کے سرے پر آکر کھڑا ہو گیا۔ اور شمال کی جانب منہ کرکے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر وہ اس سمت کو دیکھنے لگا جس طرح سنجوگ اس سے جدا ہو کر گئی تھی آخری بار ۔

اس نے اس گلیارے پر اپنی نظریں جما دیں۔ جسکے دونوں طرف کھائیوں کے اوپر ناگ پھنی اور سرپت کے جھنڈ اُگے ہوئے تھے۔ مگر اسے وہ نظر نہ آیا جسے وہ دیکھنا چاہتا تھا۔

اور اسے ایسا محسوس ہُوا کہ جیسے اب وہ کبھی کچھ نہ دیکھ سکے گا —— اس کی نظریں پتھرا گئیں اور اس کے دل پر کوئی زور زور سے گھونسے مارنے لگا۔

وہ بیتاب ہو گیا، بےچین ہو گیا وہ —— اور بےاختیار وہ چیخ اُٹھا۔

"سنجوگ تم کہاں ہو۔ کہاں ہو تم سنجوگ"

اس کا سر زور سے چکرایا۔ اور وہ اسی جگہ اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

"میں یہاں ہوں ۔۔۔ میں یہاں ہوں شنکاری ۔۔۔!"

سنجوگ بڑے اضطراب کے عالم میں اپنی کھاٹ پر پڑی کروٹ بدل رہی تھی۔ وہ اپنے دل کو بڑی مضبوطی سے اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑے ہوئے تھی۔ اور اسکی آنکھوں سے زار و قطار آنسو بہہ رہے تھے۔

اس کا چہرہ مرجھا گیا تھا۔ اور ہونٹ خشک ہو گئے تھے۔ اُسے اس وقت ایک سو چار ڈگری کا بخار چڑھا ہوا تھا۔ اور اس پر ہذیانی کیفیت طاری تھی۔ اور وہ بڑبڑا رہی تھی۔

"شنکاری ۔۔۔! مجھے معاف کرنا تم۔ اگر میں تمہیں نہ مل سکوں۔ اس کا مجھے یقین ہو چلا ہے میں اب بچ نہیں سکتی شنکاری مجھے ۔۔۔ مجھے نہ جانے کیا ہو گیا ہے جیسے کہ کوئی میرا کلیجہ مسلے ڈالے رہا ہے۔ جیسے کوئی گھونسے مار رہا ہے میرے دل پر۔

میری آنکھیں جلی جا رہی ہیں ۔۔۔ میرا دل جلا جا رہا ہے۔ اور میرا سانس ۔۔۔ میرا سانس اٹک رہا ہے۔ میں مر جاؤں گی ۔۔ میں ضرور مر جاؤنگی۔ اسکا مجھے وشواس ہو گیا ہے

اور تم ۔۔۔ تم نہیں آئے۔ میں روز تمہارا انتظار کرتی تھی۔ روز ۔۔۔ روز روز بلا ناغہ ۔۔۔ میں نے بغیر ایک پلک جھپکائے۔ یک ٹک تمہاری راہ تکی ہے۔ میری آنکھیں تمہارے راستوں پر لگے لگے پتھرا گئیں ہیں۔ دکھنے لگی ہیں اب۔ بہت درد ہو رہا ہے ان میں۔ مگر تم نہ آئے۔

تم مجھے بھول گئے۔ بھول گئے ہو تم مجھے۔ مگر میں تمہیں نہیں بھولی۔ میں تمہیں نہ بھلاؤں گی۔ چاہے تم مجھے بھلے ہی یاد نہ کرو۔

بابا کہتے ہیں مجھ پر آسیب کا سایہ پڑ گیا ہے۔ وہ کیا جانے بے چارے۔ انہیں

کیا پتہ ——کہ مجھ پر کس کا سایہ پڑا ہے۔ وہ مجھے بہت چاہتے ہیں۔ بہت پیار کرتے ہیں وہ مجھے —— مگر اب کسی کے چاہنے یا نہ چاہنے سے ہونا بھی کیا ہے میری موت قریب آگئی ہے۔ اور یہ بات سوا میرے اور کوئی نہیں جانتا۔

فنکاری —— ! ایشور کے لیے ایک بار تم یہاں آجاؤ۔ کیا تم اب کبھی نہ آؤ گے۔ کبھی نہیں۔ کیا تم سچ مچ مجھے بھول گئے —— بالکل بھول گئے مجھے۔

اچھا ! کوئی بات نہیں۔ بھول جاؤ —— اور سدا سکھی رہو۔ اور تم سدا سکھی رہو۔ یہی سکھ ہے میرا۔ یہی ایک لگن ہے میرے دل کی۔

اُف ! آہ —— ! —— اُف —— فنکاری —— !"

سنجوگ زور سے تڑپی۔ اور اچھل کر پلنگ پر سے نیچے گر پڑی اور بے ہوش ہو گئی۔

اس کا بابا ویدجی سے اس کے لئے دوائی لینے چلا گیا تھا۔ وہ عین اسی وقت باہر سے آگیا اور بلبلاتا ہوا اس کی طرف لپکا۔

"میری بیٹی —— ! کیا ہو گیا تجھے رانی بیٹا —— ؟"

اس نے بڑی مشکل سے سنجوگ کو اٹھا کر پلنگ پر لٹایا۔ بیچارے کی سمجھ میں خاک بھی نہیں آرہا تھا کہ وہ اکیلا آدمی کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ کس طرح ہوش میں لائے۔ اپنی بیٹی کو۔

وہ پریشان ہو کر رونے لگا۔

"سنجوگ میری بٹیا —" وہ زار و قطار رو رہا تھا۔

سنجوگ! میری زندگی سنجوگ ہے!!

جیون دیوانوں کی طرح چیخا ـــــ اور پہاڑی پہ سے اس کا پیر پھسل گیا۔ وہ اوندھے منہ نیچے گرا۔ اور بہت دور تک پہاڑی کی ڈھلوان پہ سے نیچے لڑھکتا ہوا چلا گیا۔

ایک چھوٹے سے پودے کی جڑ سے ٹکرا کر وہ رُکا۔ اور اسی پودے کے چھوٹے سے تنے کو پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا سارا جسم رگڑ کھا گیا تھا۔ پیشانی پہ بڑے زور کی چوٹ لگی تھی۔ اور اس سے خون بہنے لگا تھا۔

مگر بڑی خود اعتمادی سے اس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ اور آہستہ آہستہ اُترتا ہوا نیچے آ گیا۔ نیچے آ کر اس نے ایک چھوٹے سے گڑھے سے پانی لیکر اپنا منہ دھویا۔ جیب سے رومال نکال کر اسے پانی سے تر کیا۔ اور پیشانی پر پٹی باندھ لی

شام ہو چکی تھی۔ اور تاریکی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ آہستہ خرامی کے ساتھ اپنی جیپ تک آیا۔ بڑی بے دلی کے ساتھ اس پر بیٹھا۔ اسے اسٹارٹ کیا اور دھیمی رفتار کے ساتھ گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

اور جاتے جاتے ایک بار اور اس نے اپنی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے پہاڑی کی طرف گھوم کر دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک سرد آہ پھیل گئی۔

اور وہ اپنے ہونٹ چباتا ہوا روانہ ہو گیا۔

اسے یقین ہو چکا تھا کہ اب وہ سنجوگ کو کبھی نہ دیکھ سکے گا۔ کبھی نہیں تمام عمر وہ اب اسے نہ مل سکے گا۔ نہ جانے کیوں۔ یہ بات بار بار اس کے ذہن میں آتی ـــــ

اور اپنے ذہن میں آئی ہوئی اس بات پر وہ ایمان لے آیا تھا۔
اس کی جیپ گرد و غبار کے بادل چھوڑتی ہوئی تاریک رات میں روانہ
ہو گئی۔ ایک ایسے راستے کو چھوڑ کر ایک ایسے راستہ کی طرف جس پر کہ وہ دل
سے جانا نہ چاہتا تھا۔
مگر وہ چلتا گیا۔ گم سم؛ اور خاموش۔

جیون یکبارگی بیقرار ہوکر صوفہ پر سے اُٹھ بیٹھا۔

"رامو ——!" وہ بڑی زور سے چیخا۔

"ادھر آؤ رامو ——"

اور رامو باہر سے بھاگتا ہوا آیا۔

"کیا ہوا صاحب ——؟"

اس وقت وہ جیون کی وحشت زدہ صورت دیکھ کر گھبرا گیا۔ جیون کا پورا چہرہ پسینے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں اور اس کا سانس زور زور سے چل رہا تھا۔ جیسے کہ وہ میلوں دوڑ کر آیا ہو۔

وہ آتے ہی جیون سے لپٹ گیا۔

"کیا ہوا صاحب ——"

وہ جیون کو جھنجھوڑ رہا تھا۔

"کیا ہوا صاحب ـــ بولئے نہ ـــ کیا آپ کوئی بھیانک سپنہ دیکھ رہے تھے ۔ ڈر گئے کیا آپ ؟"

وہ بڑی ہی بے چینی کے ساتھ یہ الٹے پلٹے سوالات جیون سے کر رہا تھا ۔ اور وہ تھا کہ ہکا بکا ـــ آنکھیں پھاڑے ہوئے اور منہ کھولے کھڑا تھا ۔ گم سم اور خاموش ! ۔ اس کے چہرے سے وحشت ٹپک رہی تھی ۔

"بیٹھ جائیے صاحب ، یہاں بیٹھ جائیے ۔ اس جگہ ۔"

رامو نے بڑی محبت اور پیار سے جیون کے بازوؤں کو پکڑ کر اسے صوفہ پر بٹھا دیا ۔

"ٹھہرئیے صاحب ۔ میں آپ کے لئے ایک گلاس شربت لیکر آتا ہوں ۔"

اور ابھی وہ اسے چھوڑ کر ہٹا ہی تھا کہ شہلا آگئی ۔

"کیا بات ہے رامو ؟" وہ رامو کی گھبراہٹ کو دیکھ کر اسی جگہ ٹھٹھک کر کھڑی ہو گئی ۔

"صاحب پر شاید پھر دل کا دورہ پڑا ہے ۔ دیکھئے ذرا آپ انہیں ۔ میں ابھی شربت بنا کر لاتا ہوں ۔"

"ارے ! "

شہلا بڑی تیزی سے لپک کر جیون کے پاس پہنچی ۔ اس نے دیکھا کہ جیون صوفہ کے داہنے بازو پر اپنی پیشانی ٹکائے گم صم بدھ پڑا ہے ۔

"کیا ہوا آپ کو ـــ ؟"

اس نے صوفہ پر جیون کے قریب بیٹھ کر اس کا سر اپنے دونوں ہاتھوں سے اٹھاتے ہوئے پوچھا ۔

"کیسی طبیعت ہے آپ کی —— خیر تو ہے"

"کچھ نہیں ——"

جیون کے چہرے سے بڑی مایوسی اور بیچارگی ٹپک رہی تھی۔

"لیجئے صاحب یہ شربت"

شہلا نے گلاس راموں کے ہاتھ سے لے لیا۔

"لیجئے یہ شربت پی لیجئے" اس نے گلاس جیون کے منہ سے لگا دیا۔

"دل کو سکون مل جائے گا"

وہ بڑی محبت سے جیون کا سر سہلا رہی تھی۔

"میں ابھی ڈاکٹر کو بلا کر لاتی ہوں۔

"ڈاکٹر کی کیا ضرورت ہے" جیون نے تھوڑا سا شربت پی کر گلاس میز پر رکھنا چاہا۔ وہ میز ٹٹول رہا تھا۔ کہ شہلا نے گلاس اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ اور وہ گلاس میز پر رکھتے ہوئے بڑی ملائمیت سے بولی۔

"ڈاکٹر آجائے گا تو اس میں ہرج ہی کونسا ہے"

"پھر بھی ؛ ضرورت کیا ہے"

"ممکن ہے وہ ایک آدھ انجکشن ہی لگا دے۔ سکون ملجائیگا آپ کو"

"جیون چپ ہو رہا۔ اور شہلا ڈاکٹر کو بلانے چلی گئی۔

❖ ❖ ❖ ❖

"تم کہاں سے آرہی ہو اس وقت"

شہلا کی بہن کوشلیا نے گھر میں دیکھتے ہوئے شہلا سے سوال کیا۔

"ولنگڈن کلب سے"

"اتنی رات گئے"

"جی — !"

"کیا بجا ہے — معلوم ہے"

"ڈیڑھ بجے ہیں"

"یہ شریفوں کے اطوار ہیں"

"کلب میں سب شریف ہی آتے ہیں دیدی"

"تم بحث کرتی ہو — اور میں تمہیں زمانے کی اونچ نیچ سمجھا رہی ہوں"

"میں سب سمجھتی ہوں دیدی" شہلا نے اپنا پرس صوفے پر پھینکا —

"تم فکر نہ کرو — میں تمہاری بہن ہوں"

"مگر —"

"چھوڑو بھی دیدی —" شہلا اپنی دیدی سے لپٹ گئی —

"تم نے مسٹر جیون کی آنکھوں کے اپریشن کے بارے میں کیا سوچا؟"

"میں کیا سوچوں"

اس کی دیدی نے پیار سے اپنی بہن کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا —

"تم اسے راضی کر لو — روپیہ جتنا لگے گا میں لگاؤں گی"

"دیدی — !میری دیدی — تم کتنی اچھی دیدی ہو میری"

وہ بے اختیار اپنی دیدی سے لپٹ گئی —

"مگر ایک بات ہے" کوشلیا نے شہلا کو بغور دیکھتے ہوئے کہا —

"کہیں اس کے بعد تم اور ضدیں نہ شروع کر دو"
"جی ---- !"
"یہی کہ اب تو میں اگر شادی کروں گی تو مسٹر جیون سے ہی کروں گی"
"دیدی ---- !"
شہلا نے نظریں جھکا لیں۔
"کیسی باتیں کرتی ہو تم"
"اچھا اب جاؤ۔ سو رہو جا کر"
اور جب وہ سونے کے لئے اپنے کمرے میں جانے لگی تو کچھ سوچ کر کوشلیا نے اُسے آواز دی۔
"ذرا ٹھہرنا تو سہی"
"جی ---- !" شہلا رک گئی۔
اور کوشلیا نے اس کے قریب جا کر سوال کیا۔
"تم کلب سے آ رہی ہو ؟"
"جی ہاں"
"اور جیون کو اپنی گاڑی پر اسکے گھر تک چھوڑنے کون گیا تھا" ؟
"دیدی ---- !"
شہلا نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔
"تم سمجھتی ہو کہ میں تم سے جھوٹ بولتی ہوں۔ حالانکہ میں نے آج تک تم سے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ اگر میں باتیں تم سے ایسی ہی چھپایا کرتی یا تو آج تک تم جیون کے

بارے میں نہ جان سکتیں۔ مگر میں نے ان کے بارے میں بھی ہر بات تم سے بتادی اور اب تم مجھ سے ایسے الٹے سیدھے سوال کر رہی ہو۔"

وہ کچھ برا مان گئی۔

"میں مسٹر جیون کے گھر انہیں چھوڑنے اس لئے نہیں گئی کہ وہ آجکل کلب آہی نہیں رہے"

"برا مان گئی بہ بھنو"

کوشلیا نے اپنی بہن کو پوچھا۔

"اچھا بھئی غلطی ہوگئی۔ واقعی مجھے اپنی بہن سے اس قسم کا مذاق نہ کرنا چاہیئے تھا۔"

"نہیں دیدی:" شہلا نے پوری سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

"میں تمہاری قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میں کبھی کوئی بات تم سے نہیں چھپاتی۔"

"اچھا اچھا۔ اب سو رہو جا کر" کوشلیا کچھ چڑچڑی بن گئی۔

"کل جا کر ذرا آفس ہو آنا۔ کل آفس میں تنخواہ کا دن ہے۔"

اور بغیر کوئی جواب دیئے ہوئے شہلا اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

جیون انگلستان میں تھا۔ اور بملا شہر میں کالج کے ہوسٹل ہی میں رہی تھی رائے بہادر صاحب کا جی گھبرایا کرتا تھا وہ اکثر اداس دکھائی دیتے تھے۔ اور انکا حد سے زیادہ منہ چڑھا ہُوا ملازم ہریا ہر وقت ان سے اُنکے دِل بہلانے کی باتیں کیا کرتا قصے سناتا لطیفے گڑھتا۔ اور کوشش کیا کرتا کہ اِدھر ادھر کی باتوں سے ان کا دل بہلا رہے

ایک دِن رائے بہادر صاحب بہت زیادہ اداس تھے۔ وہ چپ چاپ اپنی باہر والی بیٹھک میں اداس بیٹھے تھے کہ ہریا آ گیا۔

"جے رام جی کی مالک"

"جے رام جی"

"کیا بات ہے سرکار"

وہ رائے بہادر صاحب کے پیروں کے پاس فرش پر بیٹھ کر ان کے پاؤں دبانے لگا۔

"آخر بات کیا ہے مالک جب دیکھتا ہوں آپ کے چہرے پر اداسی دیکھتا ہوں"۔

رائے بہادر صاحب ایک سرد آہ بھر کر بولے۔

"کیا بتاؤں ہریا۔ آج کل ہر وقت جی گھبراتا ہے۔"

"تو کیا بات بتاؤں سرکار۔"

"کیا ۔۔۔ ؟"

"چلئے دبنا پور ہو آیئے۔"

"ابھی تو وصول تحصیل کا وقت بھی نہیں ہے۔ کیا کریں گے وہاں جاکر۔"

"اجی سرکار ۔۔۔ !"

ہریا بولا۔

"گو کی بار بیٹے وصول تحصیل کو، شکار کھیلئے گا وہاں، جی بہل جائے گا۔ اور آب و ہوا بدل جائے گی۔"

"شکار ۔۔۔ ؟"

رائے بہادر صاحب طنزاً مسکرائے۔

"اب شکار ہم کیا کھیلیں گے۔"

"ہرج کیا ہے سرکار۔ جی بہل جائیگا۔ اور ہم جانور بھی کم ہوں گے۔ آج کل فصلوں کا بڑا نقصان کر رہے ہیں۔"

"مگر یہی بات ۔۔۔"

"چھوڑیئے بھی سرکار۔" ہریا نے بات کاٹی۔

"ہم شکار کو ضرور چلیں گے۔"

"کیوں کیا جنگلی سور کا مزہ چکھے بہت دن بیت گئے ہیں۔" رائے بہادر صاحب مسکرائے۔

"یہی سمجھ لیجئے مالک۔ مگر میں اس مرتبہ تو آپکو شکار پہ لیجا کر ہی دم لونگا!"

"اچھی بھئی" رائے بہادر صاحب نے گویا اپنی شکست مانلی۔

"چلیں گے شکار پہ"

"یہ ہوئی ایک کام کی بات" ہریا خوش ہو کر رائے بہادر صاحب کے پاؤں اور زور زور سے دبانے لگا۔

"تو کروں تیاری سرکار"

"ہوں — کرو"

"کب چلئے گا —؟"

"جب چلنا ہی ہے" رائے بہادر صاحب بولے۔

"تو کب کا کیا سوال، آج ہی چلو"

"تو میں ابھی سب بندوبست کرتا ہوں"

اور یہ کہکر ہریا رائے بہادر صاحب کے پاؤں چھوڑ کر باہر کی طرف لپکا۔

"سرکار —!" ہریا نے سامنے والی پہاڑی کی طرف اشارہ کرکے کہا۔

"اس پہاڑی کے اس اور شکار بھرا پڑا ہے مالک"

"اسی طرف ہم بھی چل رہے ہیں"

جیپ گھما کر پہاڑی کے اس طرف کھڑی کر دی گئی۔ سامنے ٹیلے پر ایک چیتل سورج کی طرف منہ اٹھائے اور اپنی آنکھیں بند کئے کھڑا تھا۔

"لگا دیجئے سرکار۔ لگا دیجئے۔ جمائیے ایک گولی شمسیرے کے"

ہریا نے کاناپھوسی والے انداز میں رائے صاحب بہادر کو مشورہ دیا۔

"میں جانور کو کبھی دھوکے سے نہیں مارتا" وہ بولے "پہلے تم ایک ڈھیلا مار کر ہوشیار کر دو"

ہریا نے گویا ابرا مان کر کہا ہی تھا۔ کہ چیتل ہوشیار ہو گیا۔ اس نے گردن گھما کر دیکھا۔ اور وہ ایک قلانچ بھر کر نظروں سے اوجھل ہونے ہی والا تھا کہ سنسناتی ہوئی گولی آئی۔ اور عین اسوقت لگی اسکی جبکہ وہ جست لگا چکا تھا۔

ایک زور کے دھماکے کے ساتھ وہ زمین پر گرا اور تڑپنے لگا۔

"کمال ہو گیا مالک۔ کیا نشانہ ہے سرکار آپ کا"

ہریا یہ کہتا ہوا شکار کی طرف لپکا۔

اور ادھر پہاڑی پر بندوق کی آواز سنکر ایک بیقرار دل کو قرار آگیا۔ دل شکستہ سنجوگ یہ سمجھی کہ آج اتنی مدت کے بعد اسکے شکاری کو اسکا خیال آگیا ہے اس نے سوچا اسکی دعائیں بیکار نہیں گئیں۔ اور اس کے بہتے ہوئے آنسوؤں کی

لاج اس کے مالک نے رکھ لی ہے۔ اسکا بچھڑا ہوا محبوب اُسے واپس مل گیا ہے اُس کا دل اس کے سینے میں مارے خوشی کے بلیّوں اچھلنے لگا۔ اور وہ پہاڑی کے اوپر سے بے تحاشا بھاگی۔ اس نے پہاڑی کے اس طرف آکر دیکھا کہ اسکے محبوب کی جیپ کھڑی ہے مارے خوشی کے اس کا دل اس کے حلق میں آکر پھنس گیا۔ اور اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔

وہ سر پہ پیر رکھ کر بھاگی۔ اور اس نے جیپ کے نزدیک آ کر ایک زور کی ٹھوکر کھائی

,, شکاری —— !"

اس کے منہ سے نکلا ہی تھا کہ وہ ٹھوکر کھا کر اوندھے منہ زمین پہ گر گئی۔

اس نے لیٹے ہی لیٹے اپنا سر اٹھایا۔

,, تم آ گئے شکاری —"

اور وہ بڑی بیتابی سے اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

,, تمہیں کیا معلوم شکاری کہ میں —"

اور جونہی اُسکی نظریں اوپر اٹھیں۔ وہ سہم کر چپ ہو گئی۔ اس کی نظریں نیچے جھک گئیں اور وہ جلدی جلدی سے تھوک نگلنے لگی۔ اور جلدی جلدی پلک جھپکاتے ہوئے بے تحاشا الٹے پاؤں بھاگی وہاں سے۔

رائے بہادر صاحب کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ انہیں ایسا محسوس ہوا کہ جیسے انکے سامنے سے بجلی کوند گئی ہو جیسے کہ ایک شعلہ ہو جو انکی نظروں کے سامنے سے بھڑک کر غائب ہو گیا ہو۔ جیسے کہ ایک انجانا تیر ہو جو انکے جگر میں پیوست ہو گیا ہو۔ اگر وہ پاگلوں کی طرح منہ پھاڑے اور آنکھیں کھولے اسے دیکھتے رہے

اور وہ پہاڑی کے اوپر پہنچکر ان کی نظروں سے غائب ہوگئی ہو۔ اور وہ حیرت و استعجاب کے سمندر میں کھڑے غوطے کھاتے رہے۔

اپنی ساری زندگی میں انہوں نے اتنی خوبصورت لڑکی کبھی نہیں دیکھی تھی۔ انکے بوڑھے خون میں گردش پیدا ہوگئی۔ اور ان کی نہ جانے کب کی سوتی ہوئی اُمنگوں میں طوفان آگیا۔ اور ان کا پژمردہ دل ان کے پہلو میں اتنی زور زور سے دھڑکنے لگا کہ وہ خود اپنی حالت سے پریشان ہوگئے۔

اور جب ہریا دو چار آدمیوں کے ساتھ شکار لدوا کر انکے قریب آیا تو وہ پسینہ سے شرابور ہوچکے تھے۔

"دیکھئے تو مالک، کتنا بڑا چیتل مارا ہے آپ نے!"

"ارے۔! کیا ہوا مالک — ؟"

وہ ان کے سامنے اُن سے کھڑا پوچھ رہا تھا۔

"کیا بات ہے — ؟"

اور رائے بہادر صاحب جو گم سم اور کھوئے انداز میں پہاڑی کی طرف یک ٹک دیکھ رہے تھے۔ چونک پڑے۔

"ہیں — !"

اور پھر انہوں نے اپنے ہوش و حواس یکجا کئے۔ وہ ہریا کی طرف دیکھکر بولے

"کیا ہوا — ! کیا پوچھ رہے ہو تم مجھ سے" ؟

"وہاں اس پہاڑی پر کیا ہے ؟" ہریا نے پہاڑی کی طرف اشارہ کر کے ان سے پوچھا

"کچھ نہیں — کچھ بھی تو نہیں"

"مگر آپ اتنے پریشان کیوں ہیں مالک"

"نہیں! نہیں!! بالکل نہیں، میں بالکل پریشان نہیں ہوں"

"کوئی بات تو ضرور ہے مالک"

"کوئی بات نہیں" وہ قدرے جھنجھلا گئے۔

"چلو اب واپس چلیں"

وہ جیپ پر بیٹھ چکے تھے۔

"کیا اور شکار نہ کھیلئے گا"

"نہیں ——!"

اور رائے بہادر صاحب نے "نہیں" کچھ اس انداز سے کہا کہ لاکھ منہ لگے ہونے پر بھی ہریا کی جرأت نہ ہوئی کہ وہ ان سے کوئی بات پوچھ سکے۔ وہ بالکل خاموش ہو رہا۔

اور رائے بہادر صاحب نے جیپ دیپا پور کے راستے پر ڈال دی۔ وہ اپنے بنگلے پر واپس جا رہے تھے۔

پہاڑی پر درخت کی جھکی ہوئی اس شاخ سے جس پر کہ اس کا محبوب اکثر آگر لیٹ جایا کرتا تھا سنجوگ اپنا سر لگائے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

آج چھ سات مہینے کے بعد بندوق کی آواز سے وہ چونک پڑی تھی اور اسے یقین ہو گیا تھا کہ اس کا بچھڑا ہوا محبوب اسے واپس مل گیا ہے۔ اس کے ایشور نے اس کی دن رات کی دعاؤں کو سن لیا ہے اور وہ سمجھی تھی کہ اب اس کے بیقرار دل کو قرار آجائے گا۔

مگر دائے ری ناکامی کہ اس کی تمام آرزوئیں دِل کی دِل ہی میں رہ گئیں۔ اور
اسکی ایک لمحہ کی وہ خوشی جو اسے انجان پنے میں نصیب ہوئی تھی محض سراب
ثابت ہوئی۔ اس کا محبوب اسے نہ مل سکا اور وہ ایک پل کے لئے بھی اس
کا سندر مکھڑا نہ دیکھ سکی۔

اس کی ساری آرزوئیں خاک میں مل گئیں۔ اسکی تمناؤں نے دم توڑ دیا۔
اور اس کے ارمان اس کے دِل میں گھٹ کر فنا ہو گئے۔ دفن ہو گئے وہ اس
کے دل میں۔

اسے یقین ہو گیا کہ اب وہ اپنے پریتم کو کبھی نہ دیکھ سکے گی۔ اس کا محبوب
اب اُسے اس جنم میں کبھی نہ مل سکے گا۔

کاگا سب تن کھائیو کہ چُن چُن کھائیو ماس
یہ دو نیناں مت کھائیو مجھے پیا ملن کی آس

اور اس نے بے چین ہو کر اپنی نگاہیں اس راستہ پر جما دیں جس پر سے چل
کر اس کا محبوب اس کے پاس آیا کرتا تھا۔

رات آدھی سے زیادہ جا چکی تھی اور رائے بہادر صاحب ابھی تک نہیں سوئے تھے۔ اور وہ سوتے بھی کیسے ان کے دل میں طوفان جو اُٹھا ہُوا تھا ہلچل جو مچی ہوئی تھی۔ ان کے دل میں جو آج نہ جانے کیوپڈ کمبخت کو کیا سوجھی کہ وہ انہیں کو نشانہ بنا بیٹھا۔ وہ بار بار سوچتے کہاں وہ اور کہاں وہ لڑکی جو انکی عمر معاشقوں کی حد سے نکل کر اب ایک ایسے موڑ پہ پہنچ چکی تھی جہاں معاشقے نہیں کیے جاتے۔ جہاں ریاضت کی جاتی ہے۔ جہاں دان پن اور خیرات کے کام ہوتے ہیں۔ جہاں یہ خواہش ہونی چاہیے کہ ہم اپنے بیٹوں کے سہروں کے پھول چنیں۔ جہاں یہ ارمان مچلنے چاہئیں کہ ہم اپنے اولادوں کے فرائض سے سبکدوشی حاصل کریں۔
جہاں اولاد کی محبت ہوتی ہے۔ جہاں پہنچکر انسان بیٹوں کے بیٹوں کی خواہش کرتا ہے۔ جہاں پہنچکر وہ یہ سوچنے لگتا ہے۔ کہ وہ باپ ہے وہ دادا ہے وہ نانا ہے اور دنیا جہاں کی نوجوان لڑکیاں اس کی اپنی بچیاں ہیں۔
بار بار رائے بہادر صاحب اپنے فاسد خیالات کو پرے دھکیلنا چاہتے تھے

اپنے ذہن کو اس خواہش سے صاف کرنا چاہتے تھے کہ وہ اس لڑکی کو اپنا لیں جو شام کو ان کے دل پہ تیر چلا کر گئی ہے۔ وہ سوچتے یہ بڑے شرم کی بات ہے بڑی جگ ہنسائی ہوگی اس میں کہ بجائے بیٹی اور بیٹا بیاہنے کے وہ اپنا بیاہ رچا رہے ہیں۔ وہ ہر طرح سے اپنے دل کو سمجھاتے۔ ہر اونچ نیچ سے آگاہ کرنا چاہتے اُسے۔

مگر وہ ان کی کوئی بات نہ سنتا۔ وہ بار بار یہی تقاضا کرتا کہ تم ابھی بوڑھے نہیں ہوئے۔ تم ابھی تک جوان ہو۔ تم رائے بہادر صاحب نہیں ہو۔ تم صرف دینا ناتھ ہو۔ دینا ناتھ جو مرد ہے اور جسے ہر حال میں اور ہر وقت عشق کرنے کا حق ہے

تم مرد ہو۔ تم دینا ناتھ ہو۔ اور تمہارے پاس سب کچھ ہے۔ کیا کچھ نہیں ہے تمہارے پاس۔ دولت ہے حشمت ہے۔ عزت ہے۔ جاہ اور مرتبہ ہے اور تم جو کرنا چاہو بڑے شوق سے کر سکتے ہو۔ دنیا تم پہ انگلی نہیں اٹھا سکتی وہ تم پر انگلی کبھی نہیں اٹھائے گی۔

اس لئے کہ انگلیاں ان پر اٹھتی ہیں جو دنیا میں کچھ نہیں ہوتے۔ جو غریب ہوتے ہیں۔ جنکا سوسائٹی میں کوئی اثر و رسوخ نہیں ہوتا۔ جو ادنےٰ درجے کے انسان کہلاتے ہیں۔

اور تم۔ تم سب کچھ کر سکتے ہو۔ سماج تمہارا ہے اس لئے کہ تم صاحب حیثیت ہو جاگیردار ہو۔ اور سوسائٹی تمہاری اس لئے غلام ہے کہ تم اپنے روپیے سے اسکا منہ بند کر سکتے ہو۔ تمہارا ہر فعل قابل تعریف ہے اور تمہاری ہر بات لاکھ روپے کی ہے

غرضیکہ اسی ادھیڑ بن اور اسی کشمکش میں صبح ہو گئی اور رائے بہادر صاحب

رات بھر نہ سوئے۔ ایک منٹ کے لئے بھی اُنکی آنکھ نہ لگی۔

اور صبح جب وہ اپنے بستر پر سے اُٹھے تو انکے سارے جسم میں درد ہو رہا تھا۔ طبیعت بھاری تھی اور آنکھیں جل رہی تھیں۔

کہ اتنے میں ہریا آگیا۔ اور وہ رائے بہادر صاحب کی یہ بدحالی دیکھکر بولا۔

"کیا بات ہے سرکار! کیا رات کو آپ سوئے نہیں"؟

"نہیں ہریا" رائے بہادر صاحب بولے۔

"نہ جانے کیا بات ہے۔ میں رات بھر نہیں سو سکا۔"

"بات کیا ہوئی"؟

"ایشور جانے"

"کوئی بات ضرور ہوئی ہے" ہریا بڑی بے تکلفی سے بولا۔

"کل شام سے میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ کچھ کھوئے کھوئے سے ہیں"

اور پھر وہ اُن کے پیر دباتے ہوئے گویا ہُوا۔

"کل تو میں ڈر کے مارے کچھ نہ بول سکا سرکار۔ مگر میرا من کہہ رہا تھا کہ کوئی بات ہوئی ضرور ہے۔ بھلا آپ ہی سوچئے نہ مالک آپ کبھی اس طرح بھی پریشان ہوئے ہیں کبھی۔ میں تو جنم جنمان کا نمک خوار ہوں آپ کا مالک۔ مگر آجتک اس سے پہلے تو میں نے ایسی پریشانی کبھی دیکھی نہیں آپ کے چہرہ پر حضور"

رائے بہادر صاحب چپ تھے۔ کہ ہریا پھر بولا۔

"کل شکار سے جب میں لوٹا تو حضور کا چہرہ بتا رہا تھا کہ کوئی بہت بڑی بات ہو گئی ہے اتنی دیر میں۔ وہ تو آپ نے ڈانٹ دیا مجھے مالک نہیں تو میں کل پوچھتا آپ سے

رات کو میں بھی نیند بھر نہیں سویا۔ آپ ہی کی بات سوچتا رہا ہوں۔ سرکار میں نے بھی دنیا دیکھی ہے مالک، بچہ تھوڑا ہی ہوں اور یہ بال میں نے کبھی دھوپ میں سفید نہیں کئے"!

"ہوں ——!" رائے بہادر صاحب آرام کرسی پہ سے اٹھے اور کمرے میں ٹہلنے لگے اور ہریا انکے پیچھے پیچھے لفٹ رائٹ والے انداز میں چلتا رہا۔

"بولئے نہ مالک کیا بات ہے —؟"

اس نے رائے بہادر صاحب کو اُکسایا —

"آپ کے لئے کیا مشکل ہے سرکار۔ اگر آپ چاہیں تو آپ کے اقبال سے چڑیا کا دودھ بھی آپ کے لئے آسکتا ہے"!

"ہوں ——!"

رائے بہادر صاحب رُک کر اپنے ہونٹ کاٹنے لگے۔

"ہیرا دِوا ہ سرکار —— اگر آپ چاہیں تو ایک نہیں، آپکے تو دو، چار سو دواہ ہو سکتے ہیں مالک۔ آپ تو ایک ہی کی بات لئے پھر رہے ہیں"

"دنیا کیا کہے گی —؟"

"دنیا کیا کہے گی مالک —؟"

ہریا بڑی لاپرواہی سے بولا۔

"آپکے وواہ کا کھانا کھا کے گی انگلیاں چاٹ چاٹ کر اور کیا —!"

یکایک رائے بہادر صاحب کو کچھ خیال آیا۔ اور وہ اس بات کو جو اس وقت انکی ذرا سی ڈھیل پہ کافی سے زیادہ آگے بڑھ چکی تھی سمیٹتے ہوئے بولی —

"تو تو چہکنے لگا ہے ـــــ میرے ذرا سی مذاق پر تیری تو باچھیں کھل اٹھیں۔"
انہوں نے ہریا کو واقعی ڈانٹا۔

"جا! بھاگ یہاں سے۔ لفنگا کہیں کا۔"

اور رائے بہادر صاحب کی اس ڈانٹ پر ہریا سہم گیا۔ اور بھیگی بلی بنا ہوا پیچھے سے کھسک گیا کمرے سے۔

رائے بہادر صاحب کے ایک ہی پینترے نے اسکی ساری داؤ بازی خاک میں ملا دی۔ وہ اتنے بیوقوف نہیں تھے۔ کہ ایک ذرا سی بات کو بات کا تبنگڑ بنا دیں۔ وہ بڑے ہوشمند اور ہوشیار تھے۔ اور بگڑی ہی بات کو سنبھال لینے کی قدرت ان میں موجود تھی۔

وہ ایک ذرا سی بات پر اتنی بڑی بیوقوفی نہیں کر سکتے تھے۔ وہ جانتے تھے۔ کہ کل جو ہوا ہے غلط ہوا ہے۔ اور ایک بات جو غلط ہو اسے طول دینا وہ نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے عین موقعہ پر سوچا کہ وہ ذہنی جذبات پر آ کر بہہ گئے ہیں۔ اور اگر وہ اور زیادہ دور تک بہتے گئے تو یہ بات آگے چل کر بہت زیادہ خطرناک ہو جائے گی۔ اور پھر ہو سکتا ہے کہ وہ اسے سنبھال نہ سکیں۔

لہٰذا انہوں نے فوراً ہی فیصلہ کر لیا کہ وہ اس بات کو زیادہ نہ اچھالیں گے۔ چنگاری کو ہوا لگنے سے پہلے بجھا دینا سب سے بڑی عقلمندی ہے۔ اور وہ جانتے تھے۔ کہ یہ ہریا کتنا بڑا چالاک ہے۔ چنگاری کو ہوا دیتے ہوئے اسے دیر نہ لگے گی۔ اور پھر وہ دنیا تو ایک طرف سب سے پہلے اپنے بچوں کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے۔

لہٰذا یہ بات جیوں کی توں اسی جگہ اسی حالت میں ختم ہو گئی۔ اور وہ اسی دن دیناپور سے واپس چلے آئے۔ وہ نہیں چاہتے تھے۔ کہ نماز بخشوانے جائیں اور الٹے روزے گلے پڑیں۔

رائے بہادر صاحب تو دینا پور سے واپس آگئے لیکن ان کا دل وہاں سے واپس نہ آیا۔ وہ وہیں الجھا رہا۔ اسی لڑکی کے خیال میں اور ان کے خیالات اسی ماحول اور اسی پہاڑی کے گرد چکر کھاتے رہے۔

انکی زندگی اجیرن ہو گئی۔ اور ان کا کھانا پینا اور سونا سب چھوٹ گیا۔ انکا ہنسنا بولنا اور بات کرنا سب بند ہو چکا تھا۔ وہ اندر ہی اندر عشق کی آگ میں جلتے رہے۔ انہوں نے صدق دل سے بہتیرا کوشش کی کہ اس حماقت سے وہ اپنا دامن چھڑا لیں مگر وہ نہ چھوٹ سکا۔

لاکھ کوشش پر بھی وہ اس دیہاتی لڑکی کے خیال کو اپنے دل سے دور نہ کر سکے۔ وہ جتنی زیادہ کوشش اس خیال کو پرے دھکیلنے کی کرتے وہ اس میں اور زیادہ پھنستے جاتے۔ بار بار ان کے دل میں کوئی کچو کے لگاتا۔ چٹکیاں لیتا۔ اور وہ پریشان ہو ہو کر رہ جاتے۔ تڑاپ تڑپ اٹھتے۔

سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے وہ لڑکی انہیں یاد آتی۔ کسی کام میں ان کا جی نہ

لگتا۔ اور کسی بات سے انہیں دلچسپی نہ ہوتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بیمار رہنے لگے۔ ہلکا ہلکا بخار رہنے لگا انہیں۔ اور ہلکی ہلکی کھانسی شروع ہو گئی۔ ان کا جسم سوکھ کر آدھا رہ گیا۔

اور جب ملا چند دن کی چھٹیوں میں گھر آئی۔ تو وہ اپنے باپ کی یہ حالت دیکھ کر ششدر رہ گئی۔ پریشان ہو گئی۔ وہ غریب۔ اور اس نے اپنے پاپا سے سینکڑوں سوالات کر ڈالے۔

مگر افسوس تو اس بات کا ہوا کہ کوئی خاطر خواہ جواب اس سلسلہ میں اُسے اپنے باپ سے نہ ملا۔ اسے یہاں آکر معلوم ہوا کہ اسکے باپ کی یہ حالت آج سے نہیں ہے۔ بلکہ پورے دو ماہ سے انکی یہی حالت ہے۔

اور آخر ش بہت بے چین ہو کر ایک دن وہ اپنے پاپا سے اس بات کے پیچھے پڑ گئی کہ وہ اسے اپنی اس عجیب و غریب بیماری کی صحیح وجہ بتا دیں۔

"سچ سچ بتائیے پاپا کہ آخر بات کیا ہے"۔

وہ اپنے باپ سے الجھ رہی تھی۔

"کس بات کا غم ہے آپ کو"

"کسی بات کا نہیں بیٹی"۔ وہ پریشان ہو کر بولے۔

"کوئی بات ہو بھی تو بتاؤں نہ"

"پھر یہ حالت کیا ہو گئی ہے آپ کی"۔

"مجھے کیا معلوم"

"آپ کھانا کیوں نہیں کھاتے۔ ہر وقت غمگین اور چپ کیوں رہتے ہو"

یکھاتا نو ہوں کھاتا" وہ کچھ رو سے دیئے۔

"مگر لقمہ ہی حلق سے الٹا واپس آنے لگے تو اس میں میرا کیا قصور۔ اور چپ تو میں بالکل نہیں رہتا"

بملا عاجز آکر بولی۔

"میں انگلستان سے بھیا کو بلوائے لیتی ہوں" وہ رونے لگی۔

"آپ کی یہ حالت مجھ سے نہیں دیکھی جاتی"

"نہیں بملی ۔۔۔!"

وہ بملا کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

"ایسا غضب نہ کرنا کہیں۔ نہیں تو اس کی محنت اکارت جائے گی۔ سال خراب ہو جائے گا۔ اس کا"

اور پھر وہ بملا کی تسلی کی خاطر کہتے۔

"اچھا بابا اب میں بالکل اداس نہ رہونگا بس ۔! اور اب میں کھانا بھی خوب ڈٹ کر کھاؤنگا۔ اور ہاں! چلو ہم دونوں ابھی سیر کو چلتے ہیں"

"اچھا تو ایک بات مانیئے" بملا نے کہا۔

"آپ میرے ساتھ شہر چلیئے۔ وہاں کسی بڑے ہسپتال میں میں آپ کو دکھاؤنگی۔"

"چلو۔ مجھے کیا اعتراض ہے۔ مگر سچ بات یہ ہے کہ مجھے کوئی بیماری نہیں ہے"

"مگر میں آپ کو اپنے ساتھ ضرور لیجاؤنگی"

"چلو ۔۔۔ میں چلنے کو تیار ہوں"

اور پھر دوسرے ہی دن کملا اپنے باپ کو لیکر شہر چلی آئی —

وہاں ایک سا ہفتہ رہ کر رائے بہادر صاحب واپس آگئے۔ شہر میں کئی بڑے ڈاکٹروں نے انہیں دیکھا۔ دل جگر، پھیپھڑا، گردے ہر حصّہ جسم کا معائنہ ہوا ایکسرے لے لیا گیا۔ خون اور تھوک کی تحقیق کی گئی۔ یورن ٹسٹ ہوا۔

اور نتیجہ میں ہر رپورٹ نے صرف یہی ایک بات ظاہر کی کہ —

"کوئی بیماری نہیں ہے۔ کنڈیشن فٹ ہے"

کملا حیران تھی۔ اور ڈاکٹر پریشان تھے۔ یونہی طفل تسلیوں کیلئے چند دوائیں تجویز ہوئیں۔ کچھ نسخے تیار ہوئے اور چند ایک ٹانک کے انجکشن لگا دیئے گئے مکمل آرام اور تازہ ہوا کا مشورہ دیا گیا۔ اور بس قصہ ختم ہو گیا۔

جب کوئی ظاہرہ بیماری نہ ہو تو علاج کیا ہو خاک۔ اور رائے بہادر صاحب ساتھ خیریت کے واپس آگئے —

کملا مطمئن ہوگئی کہ اب اس کے باپ کی ساری شکایتیں دور ہو جائیں گی۔ انہیں خوب کھل کر بھوک لگے گی رات کو گہری نیند آئے گی۔ اور وہ اپنی صحت جو کھو چکے۔

ہیں Recover کر لیں گے۔

مگر عشق کی بیماری کا کیا علاج ـــــ گھر آکر رائے بہادر صاحب کی حالت ویسی ہی کی ویسی ہی رہی کہ جیسی کہ وہ پہلے تھی۔ بلکہ اب ان کی صحت زیادہ خراب ہونے لگی۔ دل کے درد " نے انہیں کہیں نہ کہیں کا نہ رکھا اور اس اپنے بڑھاپے کے عشق سے وہ پریشان ہو گئے۔

اور ایک دن وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر۔ اندھیرے ہوتے چپکے سے پھر اسی جگہ پہنچ گئے۔ جہاں انہیں نے محبت کا پہلا تیر کھایا تھا۔ وہ بہت دیر تک چھپ کر بجوگ کو دیکھتے رہے۔ تکتے رہے اُسے اور پھر واپس آگئے۔

اور اب تقریباً ہر دوسرے تیسرے دن کا ان کا یہ معمول ہو گیا تھا کہ وہ چپکے سے چھپکر وہاں سے چلے جاتے۔ اور اسے دیکھ کر چپکے سے واپس آجاتے۔ اُسے دیکھ کر جس کی محبت انکا ایمان بن چکی تھی۔ اور جسکی دید انکی زندگی کا تنہا نصب العین تھا۔

وہ سمجھتے کہ انکی اس چوری کا راز سوا انکے اور کسی کو نہیں معلوم۔ مگر سریا جو کہ بڑا ہی آفت کا پرکالا تھا انکی اس "چوری " کو خوب اچھی طرح جانتا تھا اور وہ کئی دفعہ اپنی آنکھوں سے انکی اس "پیاس " کو دیکھ آیا تھا۔ عین اسوقت جبکہ وہ اپنی اس دل کی لگی کو درشن کر کے بجھا رہے تھے۔

اور پھر آخرش وہ ایک دن موقع پا کر رائے بہادر صاحب سے کہہ ہی پڑا۔

"سرکار! کیوں اپنے جی کو روگ لگا رہے ہیں آپ "

"کیا مطلب ۔ ؟"

"مطلب یہ کہ آپ اسے اپنے دل کی رانی کیوں نہیں بنا لیتے مالک "!

"پاگل ہو گیا کیا — ؟" وہ چڑھ گئے۔

"ہاں مالک میں پاگل ہو گیا ہوں" ہریا اپنے جملوں پر زور دیتے ہوئے بولا۔ "آپ کی یہ دشا مجھ سے اب نہیں دیکھی جاتی"

وہ زور زور سے رائے بہادر صاحب کے پاؤں دبانے لگا۔

"اس میں برائی کونسا ہے سرکار۔ کیا دوسرا اوواہ کرتے نہیں لوگ۔ کیا ایسا کرنا پاپ ہے ؟"

"ہریا — !"

رائے بہادر صاحب تلملا کر اٹھ بیٹھے۔

"کیا بکتا ہے"

ہریا نے اپنی آنکھوں میں آنسو جمع کئے۔

"کچھ کہئے آپ مالک، پر آپکی یہ حالت اب مجھ سے نہیں دیکھی جاتی"

وہ کہتا گیا۔

"پریم جو دل میں ایک مرتبہ جنم لے لے سرکار پھر کبھی نہیں مرتا ملا کھ جتن پر بھی آپ اسے مار نہیں سکتے۔ اور پھر مالک آپ اس سے ڈرتے کیوں ہیں آخر پریم کرنا پاپ تو نہیں ہے۔ اور نہ یہ بات اپنے بس کی ہے مالک۔ آپ آج ہاں کہدیجئے اور کل ہی اگر وہ چھوکری آپ کے پاؤں نہ دبانے لگے تو میرا ذمہ۔ اسکے تو بھاگ کھل جائیں گے۔ خوشی سے پھولی نہ سمائے گی وہ۔ اور اسکا سارا کنبہ دھرتی پہ پاؤں نہ رکھے گا۔ جیسے آپ کا من پسند کرے سرکار۔ وہ بھگوان نہیں تو اور کیا ہے"

"ہریا — ؟"

"اب آپ مجھ سے کچھ نہ چھپائیے مالک۔ میں اپنی ان آنکھوں سے سب کچھ دیکھ چکا ہوں۔"

اور ہریا کے اس آخری جملے پر رائے بہادر صاحب گم سم ہو گئے۔ چور جیسے وہ اسے اپنی پھٹی پھٹی آنکھوں سے تکنے لگے۔ اور ہونٹ چباتے ہوئے بولے۔

"پھر۔۔ تو ہی بتلا ہریا کہ اب میں کیا کروں۔"

انھوں نے مجبور ہو کر ہریا کے سامنے اپنے سارے ہتھیار ڈال دیئے۔

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے مالک۔"

ہریا معاملہ کی اہمیت پر تھوک کر بولا۔

"رانی بنا لیجئے اپنی اسے۔"

اور پھر وہ رکا۔

"اور اگر آپ ایسا کرنا نہ چاہیں۔ تو دوسری ترکیب بھی میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے سرکار۔"

"وہ کیا۔۔۔؟"

"میں اسے زبردستی اٹھوا کر آپ کے چرنوں میں ڈال سکتا ہوں۔"

"کیا بکتا ہے تو کمینے۔۔۔ خبردار جو پھر کبھی ایسی بات منہ سے نکالی تو نے۔ میں تیری زبان باہر کھینچ لوں گا تیری۔ کمینہ کہیں کا۔ نمک حرام۔"

انہوں نے ہریا کے ایک زور کی لات ماری۔ اور وہ چاروں خانے چت دور جا گرا۔

"میں ان پاپیوں میں سے نہیں ہوں جیسے گندے ارادوں کا تو غلام ہے۔ سمجھا!"

جنہوں نے ایک زور کا طمانچہ ہریا کے منہ پر مارا۔

"سمجھ گیا سرکار۔ بالکل سمجھ گیا مالک"

ہریا دونوں ہاتھ جوڑے کھڑا، ان سے معافی مانگ رہا تھا۔

"غلطی ہو گئی مالک شما کر دیجئے۔ اب ایسی بھول کبھی نہ ہو گی۔"

وہ ہاتھ جوڑے کھڑا رہا۔ اور رائے بہادر صاحب اس کی کسی بات کا جواب نہ دیکر غصے سے بھرے ہوئے وہاں سے اٹھ کر اندر آ گئے۔

وہ اس وقت غصے میں کانپ رہے تھے۔ اور ان کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ اندر آ کر انہوں نے اپنے منہ پر بے تحاشہ طمانچے مارے۔

"کمینہ ہوں میں۔ نیچ ہوں۔ ذلیل اور کتا ہوں میں!"

انہوں نے اپنے سر کے بال نوچ ڈالے۔ اور اندر پڑے ہوئے صوفہ پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ وہ زور زور سے کانپ رہے تھے۔ جیسے کہ ان کو لرزہ چڑھا ہوا ہو۔

ولنگڈن کلب میں آج ایک بار پھر بڑی ہما ہمی نظر آرہی تھی۔ ممبروں اور ان کے مہمانوں کا ہجوم تھا۔ کہ ٹوٹا پڑ رہا تھا۔ زرق برق لباس۔ صاف شفاف صورتیں ہنستے اور مسکراتے ہوئے چہرے۔ ہیروں کی جگمگاہٹوں میں گھری ہوئی مغرب زدہ عورتیں انگریزی اور ہندوستانی عطریات کی ملی جلی خوشبوئیں۔ لونڈر۔ پوڈر۔ غازہ۔ اور سرخیوں کی بھرمار۔

برج۔ رمی۔ شطرنج اور فلیش کی محفلیں پھیلتے اور سرکتے ہوئے کارڈوں کی ہر جنبش پر سرسراتے ہوئے نوٹوں کی بے دریغ قربانیاں۔ اور پھر چھلکتے ہوئے جام اور بل کھاتی ہوئی ہمہ اقسام کی شرابیں۔

اور پھر بیروں کی صاف شفاف وردیوں کے ساتھ آرکسٹرا کی مدھر دھنیں۔ تھرکتے مچلتے اور سسکتے ہوئے جسم۔ فراخ سینوں میں جذب ہوتی ہوئی شباب کی ہنگامہ خیزیاں نشے سے بوجھل ہوتی ہوئی خمار آلود حسین آنکھیں۔ اور ساتھ ساتھ دل ہم پر رقص کرتی ہوئی مخروطی پنڈلیاں۔ اور انکا گداز۔۔۔

دلوں میں مچلتے ہوئے ولولے اور آنکھوں میں انتظار کی کیفیتیں۔ ولنگٹن کلب پورا ماحول اس بات کا منتظر تھا کہ کب اعلان ہو اور کب وہ اسٹیج پر اپنے چہیتے مغنی کو دیکھے۔

آج انتظار کی طویل گھڑیاں گنولے چھپنے کے بعد وہ اسٹیج پر آرہا تھا۔ یہاں لوگ منتظر تھے۔ اور وہاں کلب کی بالائی منزل پر جیون شہلا کے ساتھ بیٹھا ہوا سوچ رہا تھا۔ چپ چاپ اور خاموش۔

کہ کیا اسی ایک مصرف کے لئے وہ انگلستان گیا تھا۔ کیا اسی دن کے لئے اس نے انجینیئرنگ کی ڈگری حاصل کی تھی کہ وہ یہاں اپنے وطن سے اتنی دور اندھا ہو کر آئے۔ اور ولنگٹن کلب میں لوگوں کی تفریح کا سامان بن جائے کیا اس کی ساری زندگی اسی ایک کام کے لئے وقف ہو کر رہ گئی ہے۔ کہ وہ اپنی خداداد آواز کے بل بوتے پر لوگوں کو خوش کرتا رہے۔ اور اس طرح وہ اپنی روزی کا ذریعہ اپنی صرف آواز کو بنالے جس پر کبھی اس نے دھیان نہیں دیا تھا۔ جسکی ضرورت اس نے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ گانا اس کے لئے شوق کی چیز تھی جو اب اس کا اپنا شوق نہ رہ کر اس کا پیشہ بن چکا تھا۔ ایک ایسا پیشہ جس پر اسے آج تک فخر نہ ہوا۔ جسے آج تک اس نے قابل احترام چیز نہ سمجھا۔

وہ اپنے خیالات کی دنیا میں گم سوچتا رہا..........

"جل ویرا" بمبئی کی بندر گاہ پر لنگر انداز ہوا۔ اور جیون پورے ایک سال ایک مہینہ اور پانچ دن کے بعد اپنے وطن کی مقدس سرزمین میں اترا۔ مارے خوشی کے اس کا دل بلّیوں اچھل رہا تھا۔ اپنے وطن کی پاک سرزمین کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو تیر گئے۔ جذبات کی فراوانی کے باعث اسکا گلا بھر آیا۔

پورٹ پر اسکے استقبال کے لیے بملا موجود تھی فضل کریم بھی تھا اور دو چار نوکر چاکر بھی تھے۔ مگر اس کا باپ نہیں تھا۔ وہ باپ جو دنیا میں اسے سب سے زیادہ عزیز تھا۔ اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز۔ اور جس کی خاطر دنیا کی تمام مسرتیں ایک ساتھ اس کے قدموں پر نچھاور کر سکتا تھا۔

بملا دوڑ کر اس سے لپٹ گئی۔ اور اس نے اپنی پیاری بہن کو بھینچ لیا۔ وہ فضل کریم سے بغلگیر ہوا۔ وہ نوکروں سے لپٹا۔ اور خوشی کے آنسو انکی آنکھوں سے چھلک کر باہر آ گئے۔

"پاپا نہیں آئے — ؟"

بڑے تعجب اور تجسس کے ساتھ اس نے بملا سے پوچھا۔

"کیسے ہیں میرے پاپا بملی!"

"اچھے ہیں —"

بملا جیسے کوئی خاص بات اس سے چھپا رہی ہو۔ اور بملا کے اس خشک جواب پر وہ حیران رہ گیا۔ ان گنت شکوک اس کے دل میں پیدا ہوئے اور اس نے بے چینی سے سوال کیا۔

"آخر بات کیا ہے — ؟ خیریت سے تو ہیں پاپا۔ آخر وہ آئے کیوں نہیں۔

کیا کوئی خاص بات ہے۔

"نہیں بھیا ۔"! بملا نے اپنے بھائی کی گھبراہٹ اور پریشانی دور کرتے ہوئے کہا۔ "وہ ذرا بیمار ہیں۔ اور اسی لئے" اتنے لمبے سفر کی اجازت نہیں دی۔ ڈاکٹروں نے انہیں "۔

"وہ بیمار ہیں"

"ایشور جانے"! بملا نے جیسے بات ٹالی۔

"مگر گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ اچھے ہو جائیں گے"

جیون کا کھلا ہوا چہرہ یکبارگی مرجھا گیا۔ اور پھر اس نے اپنے بہت سے پروگرام یکدم سے ملتوی کر دیئے۔ ورنہ اس کا خیال تھا کہ وہ ابھی بمبئی میں کم از کم دو چار دن ٹھہرے گا۔ یہاں کی خوب جی بھر کر سیر کرے گا۔ چیزیں خریدے گا۔ ڈاولٹیز لے گا دوستوں کیلئے اور پھر خوب اچھی طرح سے گھوم پھر کر وہ اپنے گھر واپس جائیگا۔

مگر اب وہ یکدم سے آج ہی گھر کیلئے تیار ہو گیا۔ ڈک سے باہر نکل کر وہ سیدھا تھوڑا ٹفس گیا۔ اور اپنے سب کے لئے اس نے آج ہی کی تاریخ کی سیٹیں ریزرو کرائیں زرد دولتیں ہی ذہنیں ہوئیں۔ آج کی سیٹیں نہیں مل رہی تھیں۔ مگر اس نے دے دلا کر یہ کام کر ہی لیا۔

گاڑی رات کے ساڑھے نو بجے چھوٹنے والی تھی۔ اور اس وقت دن کے سوا دو بجے تھے۔ اس طرف سے فراغت پا کر۔ اور سارا سامان کلوک روم میں رکھوا کر وہ بملا کو ساتھ لئے ہوئے ادھر ادھر گھومتا رہا۔

اس کی ٹیکسی ادھر ادھر شام کے ساڑھے سات بجے تک پھرتی رہی۔ اس نے

ہمیلا کی نظر بچا کر ہی Whiteaway سے کنگن کی ایک خوبصورت جوڑی بھی خریدی ۔

لبرٹی میں پکچر دیکھی ۔ تاج میں چائے پی ۔ اور رات کا کھانا پروہت میں کھا کر وہ لوگ سوا دس بجے رات کی گاڑی سے روانہ ہو گئے ۔

موٹر کے ذریعے اسٹیشن سے گھر تک راستہ بیس منٹ سے کم کا نہیں تھا ۔ مگر جیون نے جلد بازی سے کام لیتے ہوئے اس بیس منٹ کے راستہ کو صرف آٹھ منٹ میں طے کیا ۔

وہ سیدھا اپنے باپ کے کمرے میں گیا ۔ اور جاتے ہی پاپا کہہ کر اپنے باپ سے بالکل دودھ پیتے بچوں کی طرح لپٹ کر رو پڑا ۔

رائے بہادر صاحب کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے ۔ مگر انہوں نے بیٹے کو تسلی دیتے ہوئے کہا ۔

" اب ایسا بھی بیمار کہاں ہوں ۔ وہ تو پگلی ہے کمل ۔ اس نے ضرور بات کا طومار بنا کر تجھ سے کہا ہوگا ۔ پگلے ! دیکھ تو بھلا میں کہیں بیمار ہوں "

اور یہ کہکر رائے بہادر صاحب اکڑ کر کھڑے ہو گئے۔

"میں تو تمہیں باہر ہی ملتا۔ مگر مجھے کیا معلوم تھا کہ تم لوگ اتنی جلدی آ جاؤ گے"۔

وہ مسکرائے۔

"گھبراہٹ میں کہیں راستہ میں ایکسیڈنٹ وکسیڈنٹ تو نہیں کر آئے تم"۔

"کتنے کمزور اور دبلے ہو گئے ہیں آپ" جیون نے سنجیدہ سوال کیا۔

"پہلے تو یہ بتائیے کہ آپ بیمار کیا ہیں۔؟"

"ارے کچھ بھی تو نہیں۔ یہ حکیم، ڈاکٹر تو ہوتے ہی ایسے ہیں۔ ہمیشہ ذرا سی بیماری کو بانس پر چڑھا کر پیش کر دیتے ہیں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم فکر کاہے کو کرتے ہو بیٹے"۔

اور پھر انہوں نے پوچھا۔

"اچھا بتاؤ۔ راستہ میں کوئی خاص تکلیف وکلیف تو نہیں ہوئی"۔

"جی۔ نہیں"

"انگلستان میں جی لگا۔؟"

"کوئی میم ویم نہیں لے کر آئے۔؟ بھئی واہ! سچ کہتا ہوں۔ اگر میں ہوتا تمہاری جگہ تو ضرور ایک خوبصورت میم لیکر آتا"۔

جیون مسکرایا۔

"انگریزی تعلیم مجھے پسند ہے پاپا! تہذیب نہیں"۔

"شاباش۔۔۔! شاباش۔۔۔!!!"

رائے بہادر صاحب نے جیون کی پیٹھ تھپکی۔

"تو، تو بڑا سمجھدار ہو کر لوٹا ہے انگلستان سے۔ حالانکہ اکثر حالتوں میں ایسا ہوتا نہیں ہے۔

اور پھر وہ بولے۔

"اچھا بھئی جا کر نہا دھو ڈالو۔ سفر کا تکان دور ہو جائے گا۔"

رائے بہادر صاحب کی ان باتوں سے جیون کے دل کا بہت بڑا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ اور وہ دل میں سکون و اطمینان کی ٹھنڈک لئے ہوئے نہانے چلا گیا۔

بملا ادھر ادھر سامان قرینے سے رکھنے اٹھانے لگی۔

نہا دھو کر وہ کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر جیون رائے بہادر صاحب کے پاس آ بیٹھا اور یہ دونوں باپ بیٹے بہت دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے انگلستان کی باتیں پیرس کی باتیں۔ قاہرہ کی باتیں اور نہ جانے کہاں کہاں اور کدھر کدھر کی باتیں رائے بہادر صاحب نے ہر امکانی کوشش کی کہ ان کی بیماری کا اندازہ جیون کو نہ ہو سکے۔ مگر اس نے اندازہ لگا لیا۔ کہ اس کے پاپا معمولی نہیں بلکہ شدید بیمار ہیں اس نے ان سے تو کچھ نہ کہا۔ البتہ وہ اس ادھیڑ بن میں ضرور لگ گیا کہ وہ اُن کی اس اچانک اتنی شدید قسم کی بیماری کی صحیح وجہ معلوم کر سکے۔

اور وہ صحیح وجہ معلوم کر لے گا۔ اس کا اسے پورا یقین تھا۔

باتوں باتوں میں رائے بہادر صاحب نے محسوس کیا کہ جیسے جیون اب ان طول و طویل باتوں سے کچھ کچھ الجھ سا رہا ہے۔ جیسے کہ وہ کہیں، کسی ضروری کام سے جانا

چاہتا ہو۔

اور آخرش انہوں نے پوچھا۔

"کیوں بیٹے! کیا بات ہے۔ تم کہیں جانا چاہ رہے ہو کیا۔؟"

"کوئی خاص بات تو نہیں پاپا۔ وہ ذرا اپنے دوست سے ملنے جانا تھا مجھے۔"

"دوست! کون دوست؟"

"وہ ہے ایک ۔۔۔ شہر میں رہتا ہے۔ اور اس سے اشد ضروری کام ہے مجھے۔"

"تو کل صبح چلے جانا۔"

"جی نہیں۔ وہ بات دراصل یہ ہے کہ اس کے ایک دوست کا پیغام میں انگلینڈ سے لیکر آیا ہوں۔ اور وہ بات اشد ضروری ہے۔"

"تو پھر ۔۔۔!"

"اگر آپ اجازت دیں تو میں ہو ہی آؤں۔ ضروری کام ہے۔"

"جیسی تمہاری مرضی ۔۔۔"

رائے بہادر صاحب اطمینان سے بولے۔

"مگر شام تک واپس نہ آسکو گے۔"

"آپ فکر نہ کیجئے۔ میں واپس آجاؤں گا۔"

"تو جاؤ ۔۔۔"

باپ سے اجازت لیکر وہ باہر کی طرف لپکا۔ جیپ باہر ہی پورچ میں کھڑی تھی۔ اس نے اس پہ بیٹھتے ہوئے ڈرائیور سے پوچھا۔

"اس میں پیٹرول ہے۔"

"بھرا ہوا ہے سرکار"

"وری گڈ"

تیر کی سی تیزی کے ساتھ اُسکی جیب کوٹھی سے باہر نکلی۔ اور باہر سڑک پہ بے اندازہ دھول اُڑاتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

تو پھر آ گئی یہاں ؟"

کسی نے درخت کے پیچھے سے آ کر یکبارگی کہا۔ اور وہ چونک پڑی۔

"بابا ۔۔۔ !"

وہ ہاتھ جوڑ کر بولی۔

"آج کے بعد پھر کبھی نہ آؤنگی۔ آج مجھے نہ لیجاؤ۔ یہاں سے الیشور کے لیے نہ لیجاؤ۔ میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں بابا"

"ارے ۔! آج کونسی بات ہے۔ کہیں تو، پاگل تو نہیں ہو گئی"

"صرف آج کے لئے اجازت دیدو بابا ۔ وہ رو کر بولی۔

"آج نہ جانے کیوں میرا من نہیں کرتا یہاں سے جانے کو۔ جی چاہتا ہے شام تک یہیں بیٹھی رہوں۔ میری منو کا سا مزدور پوری ہو جائے گی۔

کتنی مرتبہ منع کیا مجھے بٹیا کہ تو اس پہاڑی پر نہ آیا کر۔ مگر تو ہے کہ میری ایک بات بھی نہیں سنتی۔ ضرور اس پہاڑی پر کسی کا سایہ ہے۔ اور وہ تجھ پر پڑ گیا ہے جبھی تو تو ایسی الٹی سیدھی باتیں کرتی ہے۔ منو کا منا پوری ہو گی۔ ہنہہ " !

اس نے اپنی بیٹی کا ہاتھ بڑی زور سے کھینچا۔
چل اُٹھ یہاں سے "
" ہاتھ جوڑتی ہوں بابا۔ پاؤں پڑتی ہوں تمہارے۔ صرف آج بھر کی تو بات ہے۔ آج نہ لے جاؤ مجھے یہاں سے اور کل سے میں خود یہاں نہ آؤنگی۔
" کل ___ ! "
اس کا بابا بولا۔
" کل تو میں تجھے تیرے نیہر لیجا کر چھوڑ آؤنگا ! "
" تو پھر آج رہنے دو مجھے یہاں۔ میرا من شانت ہوا جاتا ہے۔ اچھا صرف ایک گھنٹہ اور "
وہ بڑی لجاجت سے ہاتھ جوڑ رہی تھی۔ اپنے بابا کے۔ وہ بیقرار ہو کر رونے لگی مگر اس کے باپ نے فریاد نہ سنی اور وہ اس کے دونوں ہاتھ کھینچکر بولا۔
" نہ جانے کیا بکتی ہے تو ___ چل اُٹھ۔ ضرور تجھ پر کسی کا سایہ پڑ گیا ہے "
اور وہ زبردستی سنجوگ کو وہاں سے کھینچکر لے گیا۔
اسکا بابا اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے بڑی تیزی کے ساتھ اسے پہاڑی کے مشرقی جانب سے لیکر نیچے اُتر رہا تھا۔ اور اُدھر پہاڑی کے مغربی جانب سے جیون بڑی تیزی کے ساتھ پہاڑی پر چڑھ رہا تھا۔
اور جب تک جیون پہاڑی کے اوپر آئے۔ سنجوگ کا باپ اسے پہاڑی سے لیکر نیچے اُتر چکا تھا۔ اور جب جیون پہاڑی کے اُوپر آکر سنجوگ کی تلاش میں تو اس وقت تک وہ بیچاری اپنے باپ کے آہنی پنجوں میں گرفتار اس گلیارے کو پار کر چکی تھی۔

جس کے دونوں طرف کھائیوں کے اوپر ناگ پھنی اور سرپت کے جھنڈ اُگے ہوئے تھے۔

آج جیون کی تمام اُمیدیں، اس کی ساری تمنائیں اور اس کی ساری آرزوئیں ایک ساتھ خاک میں مل گئیں۔ اسے کامل یقین ہو گیا کہ اب وہ اپنی سنجوگ سے کبھی نہ مل سکے گا۔ اسلئے کہ جب وہ آج نہیں ملی تو پھر اب وہ کب ملے گی اسے! اسکا دل بالکل خون ہو گیا۔ اور اس کی آنکھوں میں سارے زمانے کی ویرانیاں ایک ساتھ سمٹ گئیں۔

اور ظلم تو یہ ہُوا کہ نہ اکی آنکھ سے ایک آنسو ٹپکا۔ اور نہ اس کے لب سے ایک آہ باہر آئی۔ وہ بت بن گیا۔ بالکل گم سم اور خاموش۔

اسنے اپنی جیب سے وہ کنگن نکالے جو اس نے بمبئی میں ہمبا کی نظر بچا کر وائٹ اوے سے خریدے تھے۔ اس نے ان کنگنوں کو ایک بار بڑی حسرت کے ساتھ دیکھا۔ انہیں چوما۔ انہیں آنکھوں سے لگایا۔

اور پھر اس نے کنگن کی یہ بے حد حسین اور قیمتی جوڑی درخت کی جڑ میں رکھدی اس درخت کی جڑ میں جس میں ناگ دیوتا رہتے تھے۔ اور جہاں ناگ دیوتا کے سامنے وہ زندگی میں پہلی بار ایک دوسرے سے ملے تھے۔

اور پھر کنگن درخت کی جڑ میں احتیاط سے رکھ چکنے کے بعد وہ الٹے پاؤں پیچھے مڑا۔ لاکھ ضبط کے باوجود اس کے ہونٹ تھرتھرا اُٹھے۔ اسکے جگر میں ایک زور کی ٹیس اُٹھی اور وہ اپنا کلیجہ مسوس کر اسی جگہ بیٹھ گیا۔

ناگ دیوتا اس کے سامنے پھن پھیلائے جھوم رہے تھے اور دور سے بانسری کی میٹھی دھن کانوں میں آ رہی تھی۔

درد منت کش دوا نہ ہُوا
میں نہ اچھا ہُوا، بُرا نہ ہُوا

صبح کا وقت تھا۔ جیون باہر برآمدے میں کرسی ڈالے بیٹھا تھا کہ ہریا آ گیا۔

"جے رام جی کی چھوٹے سرکار۔"

اس نے جیون کو سلام کیا۔ اور جیون نے اس کے سلام کا جواب سر کی جنبش سے دیتے ہوئے اسے اپنے پاس بلایا۔

"ادھر آؤ۔"

"مالک ۔ حکم سرکار۔"

وہ جیون کے پاس بیٹھ گیا۔

"پتا جی کب سے بیمار ہیں۔"

"کوئی نو دس مہینے ہو گئے سرکار۔"

"مگر ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ انہیں کوئی بیماری نہیں ہے۔"

"انکی بیماری ڈاکٹروں کے بس کا روگ نہیں ہے مالک۔"

"کیا مطلب — !" جیون حیران رہ گیا۔

"پھر کس کے بس کا روگ ہے یہ؟"

"اپنی بیماری کی دوا خود بڑے سرکار کے ہاتھ میں ہے مالک"۔

"وہ کیسے — ؟"

"اب میں آپ سے کیا کہوں چھوٹے سرکار"۔

"کہو کہو۔ ضرور کہو۔ کوئی بات نہ چھپاؤ مجھ سے"۔

"بات دراصل یہ ہے چھوٹے سرکار کہ ......"

"تم کہتے کہتے بالکل مت رکو ہریا۔ خدمت"۔

"بڑے سرکار کو پریم ہو گیا ہے مالک"۔

"پریم — !" جیون کا منہ حیرت سے کھُلے کا کھُلا رہ گیا۔

"کس سے — ؟"

"ہے ایک لڑکی مالک"۔

"جانتے ہو تم اسے ؟"

"جانتا تو ہوں چھوٹے سرکار"۔

"پھر پتاجی اس سے دواہ کیوں نہیں کر لاتے"۔

"یہ بات انہیں کون سمجھائے چھوٹے سرکار" ہریا بولا۔

"یہ بات کہہ کر میں جوتے کھا چکا ہوں"۔

"میں بات کروں گا پتاجی سے" جیون نے پورے خود اعتمادی کے ساتھ کہا۔

"انہیں میری بات ماننی ہی پڑے گی"۔

پھر جیون کچھ سوچ کر بولا۔

"کہاں کی رہنے والی ہے وہ لڑکی؟"

"آپ ہی کی جاگیر میں بستی ہے مالک۔ یہاں سے کوئی اتر کی طرف پندرہ سولہ کوس پر۔"

"تم کیسے جانتے ہو اسے؟"

"بڑے سرکار کی حالت دیکھ کر میں نے سارا پتہ کر لیا تھا مالک۔"

"ہوں۔" جیون نے فرش پر اپنی نظریں گاڑ دیں۔ اور پھر وہ اپنی نظریں اُٹھا کر بولا۔

"ٹھہرو ہریا، تم جانا مت۔ ہم دونوں ابھی ساتھ چلیں گے۔"

"دیکھئے پاپا میں نے آپ کو اپنی قسم دلائی تھی۔" جیون لجاجت سے بولا۔

"اور میرے سر کی بھی تو کھائی ہے آپ نے۔" ململا رائے بہادر صاحب سے ضد کر رہی تھی

"آپکو تو میرے لئے نئی ماں لانی ہی پڑے گی پاپا۔" وہ بکھر گئی۔

"کیسی باتیں کرتے ہو تم لوگ۔" رائے بہادر صاحب بڑی الجھن پریشانی اور سراسیمگی کے عالم میں بولے۔

"میں خودکشی کر لوں گا۔"

وہ اس وقت اپنے بچوں کے سامنے ان سے آنکھیں چار نہیں کر سکتے تھے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"رحم کرو تم دونوں میرے اُوپر"

"تو پھر ہم سمجھ لیں کہ آپ ہم سے بالکل محبت نہیں کرتے" جیون باپ کے پیروں سے لپٹ گیا۔

"ایک اتنی سی بات بھی آپ ہماری نہیں مانتے" بملا منہ بسور کر بولی۔

"اور جبکہ پہلے ہی یہ بات مان لینے کی آپ نے ہماری قسم کھا رکھی ہے اور پھر بھی ہمارا کہا نہ رکھا"

"میں پاگل ہو جاؤں گا" رائے بہادر صاحب سچ مچ رو دیئے۔

"اور میں آپ کے چرنوں کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ میں خودکشی کر لوں گا۔

جیون نے پورے جوش کے ساتھ کہا۔

"اگر خودکشی نہ کر لوں میں تو آپ اپنی نہیں کسی چمار کی اولاد کہئے گا مجھے"

"بڑی مصیبت میں جان کر دی ہے تم لوگوں نے"

"ہماری خاطر ——" بملا ہاتھ جوڑ کر بولی۔

"جو جی میں آئے تم لوگوں کے کرو"

رائے بہادر صاحب تکیوں میں منہ چھپا کر رونے لگے۔

"ایشور! تو مجھے موت کیوں نہیں دیدیتا"

"مریں آپ کے دشمن" بملا خوش ہو کر بولی۔

"اب دیکھئے گا کہ ہماری ماتا جی آتی ہیں اس گھر میں کہ نہیں"

اور یہ کہکر وہ باہر بھاگی۔ اور ساتھ ہی ساتھ جیون بھی۔

رائے بہادر صاحب دیر تک روتے رہے۔ اور اپنا منہ نوچتے رہے۔ مارے شرم ندامت اور رنج کے انہیں بخار چڑھ آیا۔ وہ بار بار دانت پیس رہے تھے

"حرامزادے ہریا کو اگر جان سے نہ مار دوں تو میرا نام دینا ناتھ نہیں"

جیون اور ہریا جس وقت پرتاب پور پہنچے تو دن ڈھل چکا تھا۔ اور کھیتوں میں بلوں کے سائے مشرق کی طرف بڑھنے شروع ہو گئے تھے۔ جیپ جھونپڑوں گلیاروں اور راستوں سے گزر کر ایک بڑے سے مکان کے سامنے جا رکی۔

"یہی گھر ہے چھوٹے سرکار"

بہت سے میلے کچیلے بچے ننگ دھڑنگ ناک پونچھتے جیپ کے گرد جمع ہو گئے

"آواز تو لگاؤ"

جیون نے جیپ کار کا ہارن بجاتے ہوئے ہریا سے کہا۔ اور ہریا نے مکان کے دروازے پر پہنچ کر آواز لگائی۔

"چوہدری جی گھر میں ہو ---!"

وہ کنڈی پیٹنے لگا کہ اتنے میں ایک ادھیڑ عمر کا شخص نکلا۔

"جے رام جی کی ---"

"جے رام جی کی چودھری صاحب" ہریا بولا۔

"چھوٹے سرکار پدھارے ہیں"

"ارے! کون چھوٹے سرکار" چودھری ہاتھ جوڑتے ہوئے جیپ کی طرف لپکا۔

"نمستے چھوٹے سرکار"

"نمستے چودھری صاحب" جیون جیپ سے اتر پڑا۔

اور چودھری ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔

"حکم سرکار، پدھاریئے۔ دھن بھاگ ہمارے۔ کیسے تکلیف کی سرکار نے"

"آپ سے کچھ بڑی ضروری باتیں کرنی ہیں چودھری صاحب"

"دھن بھاگ مالک۔ آیئے آیئے۔ پدھاریئے مالک"

اور جلدی جلدی سے اس نے باہر کا کمرہ کھولا۔ تخت پر قالین بچھا کر اور گاؤ تکیہ لگا کر اس نے جیون کو بٹھایا۔ اور پھر اس کے سامنے زمین پر بیٹھ کر ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔

"حکم کیجئے غریب پرور"

"ارے! ارے! آپ یہاں بیٹھئے میرے پاس"

جیون نے ہاتھ پکڑ کر چودھری کو زمین سے اٹھاتے ہوئے کہا۔

"آپ ہمارے بزرگ ہیں۔ بڑے ہیں آپ"

"یہ آپ کی بڑائی ہے مالک کہ آپ مجھے ایسا سمجھتے ہیں" چودھری زمین پر سے اٹھتے ہوئے بولا۔

"اچھا ٹھہریئے۔ پہلے تو میں کچھ جل پانی تو لے کر آؤں"

"اسکی ضرورت نہیں چودھری کاکا"

"ہے کیوں نہیں سرکار"

اور یہ کہتا ہوا۔ چودھری مکان کے اندر چلا گیا۔ اور پھر تھوڑی دیر بعد لوٹے میں دودھ کا شربت اور چمکدار شیشے کا گلاس لیکر باہر نکلا۔

"شربت پیجئے مالک"

وہ گلاس بھر کر جیون کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

"دور سے چل کر آئے ہیں آپ۔ پیاس لگ رہی ہوگی"

"جانتے ہو چودھری۔" ہریا مسکرایا۔

"چھوٹے سرکار تمہارے بھاگ میں چار چاند لگانے آئے ہیں۔ راجہ بنانے آئے ہیں تمہیں راجہ۔"

اور ہریا کی اس بات پر چودھری چونک کر جیسے کچھ سوچنے لگا ہو۔

"سب ٹھیک ہے چھوٹے سرکار"

چودھری کہہ رہا تھا۔

"پر یہ بیٹی کا معاملہ ہے مالک۔ اور بڑے سرکار کی عمر پچاس سے کیا کم ہوگی۔"

"کھاتے پیتے گھرانے میں پچاس کی عمر پچیس کی رہ جاتی ہے چودھری" ہریا بولا۔

"اور پھر ہمارے سرکار! وہ نواب تک جوان دکھائی پڑتے ہیں۔ دیکھا نہیں ہے۔

کیا تم نے انہیں۔ اور پھر راجہ۔۔! راجاؤں کی عمریں تو بڑی لمبی ہوتی ہیں، چودھری بابا"

"تو پھر گستاخی معاف سرکار۔" چودھری ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "ایک عرض میری بھی ہے اگر اجازت ہو تو کہوں مالک۔"

"ضرور۔ ضرور۔" جیون بولا۔ "جو کہنا چاہتے ہیں آپ بڑے شوق سے کہئے۔ میں برا بالکل نہیں مانوں گا۔ اور پھر یہ تو بیٹی کا معاملہ ہے۔ کہنا سننا تو ہوتا ہی ہے۔ کہیں۔"

"تو سرکار!" چودھری بولا۔ "جاگیر میں آپ کا حق بالکل نہ ہوگا۔"

"ہیں۔۔ یہ کیا بات ہوئی۔" ہریا بولا ہی تھا کہ جیون نے اسے روکا۔

"تم چپ رہو۔"

اور پھر وہ چودھری سے مخاطب ہوا۔

"صاف صاف کہئے۔ میں مطلب نہیں سمجھا آپ کا چودھری کاکا۔"

"مطلب صاف ہے سرکار۔"

چودھری نے کھل کر بات کی۔

"میری بٹیا کی اولاد ہی جاگیر کی مالک ہوگی۔ اس میں آپ کا حق نہ ہوگا۔"

"مجھے بالکل منظور ہے۔" جیون بغیر کسی تامل کے بولا۔

"میں اپنے حق سے دستبردار ہو جاؤں گا۔ اور یہ بات زبانی نہیں ہوگی بلکہ میں آپ کو لکھ کر دے دوں گا۔"

"چھوٹے سرکار۔۔!" ہریا چلایا۔

"چپ رہو۔۔" جیون نے اسے ڈپٹا۔

"میں تو تاجی کے لئے میں اپنی جان دے سکتا ہوں۔ یہ تو ایک معمولی سی جاگیر کا معاملہ ہے!"

اور پھر وہ چودھری سے مخاطب ہوا۔

"تو پھر بات پکی ہو گئی چودھری کاکا"

"ابھی ایک بات اور ہے"

چودھری جیسے ہچکچا رہا ہو۔

"کیا بات ہے؟ اب کیا بات رہ گئی۔؟" جیون نے بڑی بے صبری سے استفسار کیا۔

"خفا نہ ہو جائیے سرکار" چودھری ششدر ہو کر بولا۔

"بدلے والی بات ہے مالک"

"کیا بات ہے میں سمجھا نہیں"

"یہ بات میں آپ سے اکیلے میں کرنا چاہتا ہوں سرکار"

اور جیون نے سریا کو ذرا باہر چلے جانے کا حکم دیا۔ اور سریا اٹھ کر باہر چلا گیا۔

"ہاں تو اب صاف صاف فرمایئے چودھری کاکا"

جیون بڑی بے صبری کے عالم میں بولا۔

"میں آپ کی ہر حالت میں سننے کے لئے تیار ہوں"

"میرے بھی ایک بیٹا ہے مالک"

"آپکا بیٹا — ہاں تو کیا ہوا۔ آپکے اس بیٹے کو"

"وہ میرے دوست رنبیر سنگھ کا بیٹا ہے مالک۔ اور رنبیر سنگھ کو مرے ہوئے آج پورے پانچ سال بیت گئے ہیں۔ وہ شہر میں وکیل تھے!"

"تو پھر —!"

"جیتے رہیئے سرکار ۔۔۔ "چودھری بولا ۔

"بہت بڑے نامی آدمی تھے وہ مالک ۔ ذات کے چھتری تھے اور جب وہ مرے تو انکے صرف ایک بیٹا تھا ۔ یہی کوئی ایک سال کا رہا ہوگا ۔ اسکی ماں اُسکے پیدا ہوتے ہی مر گئی تھی ۔ اور پھر جب رنبیر سنگھ مرے تو اپنا بیٹا مجھے سونپ گئے ۔ اس وقت میرے اولاد نہیں تھی ۔ اور اس وقت سے لیکر آج تک میں نے اپنے دوست کے اس بیٹے کو بالکل سگی اولاد کی طرح پالا ہے سرکار ۔

"اچھا پھر ۔۔۔ ؟"

"اور اب میرا وہ بیٹا شہر میں رہتا ہے ۔ بچپن ہی سے وہ شہر میں رہنے کا عادی ہے ۔ میں نے اسکی پڑھائی پر اس کی دیکھ بھال پر بڑا روپیہ لگایا ہے سرکار اور اب اس وقت وہ شہر میں ایک کالج میں ایم ۔ اے میں پڑھتا ہے ۔ یہاں دیہات میں وہ بہت کم کیا بالکل نہیں آتا ۔ میں ہی کبھی کبھار جا کر اسے دیکھ آتا ہوں "

"پھر ۔۔۔"

"اب بھی کوئی بات رہ گئی ہے مالک ۔۔۔ ؟"

"تو تم یہ چاہتے ہو کہ میں اپنی بہن کو اس سے بیاہ دوں " جیون کی پیشانی پر خفیف سی شکنیں اُبھر آئیں "

"جس طرح میں اپنی جوان خوبصورت ۔ اور کنواری بیٹی کو آپ کے گھر بیاہ رہا ہوں بلکہ میری بیٹی تو آپ کے تپاسے بیاہی جائے گی ۔ اور میرا بیٹا ابھی صرف تئیس ہی برس کا ہے ۔ اور ذات کا بھی گھٹیا نہیں ہے ۔ مالک پڑھا لکھا ۔ ہونہار اور لائق ہے "

"بھول ۔ ! "

"اچھا چودھری صاحب! آپ کی یہ بات بھی مجھے منظور ہے۔ مگر اس کا جواب میں آپ کو کل آکر دوں گا"

"اور اگر جواب "نال" ہو تو پھر اس رشتہ کے لئے آپ نہ آیئے گا سرکار۔ ویسے یہ گاؤں تو ہے ہی آپکا۔ جب چاہیں آسکتے ہیں۔ کسی کی روک تو ہے نہیں"

"اچھا چودھری صاحب" جیون اپنی پیشانی پر سے پسینہ پونچھتے ہوئے اٹھا۔

"میں کل اس وقت آؤں گا"

"ایسے سرکار — ! گاؤں آپ کا ہے"

"نہیں — !" جیون پورے وثوق کے ساتھ بولا۔

"میں رشتہ کے لئے آؤں گا"

"مبارک ہو آپ کو مالک"

چودھری مسکرایا۔

جیپ پورچ میں آکر رکی ہی تھی کہ اس آواز سنکر بملا بھاگی ہوئی باہر آگئی۔ اور ابھی جیون گاڑی پر سے اُترا بھی نہ تھا کہ اس نے سوالات شروع کر دیئے۔

"کیا ہوا بھیّا — ! کام بن گیا نہ — ؟"

"ہوں — !"

جیون نے گاڑی پر سے اُترتے ہوئے کہا۔

"آپ تو کچھ بُجھے بُجھے سے ہیں۔ بتایئے نہ صاف صاف کہ کیا ہوا۔"

"سب ہو گیا —"

جیون نے اندر کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ اور بملا اُس کے پیچھے پیچھے لپکی۔

"آپ تو کچھ کھوئے کھوئے سے ہیں۔"

"نہیں تو —"

"پھر کیا بات ہوا۔"

جیون نے بملا کی طرف دیکھا۔

"دم تو لینے دو۔"

"تو لے لیجئے دم آپ" بملا قدرے چڑھ کر بولی۔

"یہاں تو ایک ایک پل کاٹنا مشکل ہو گیا تھا۔ اور آپ ـــ"

"بس خفا ہو گئی ـــ" جیون نے بملا کے سر پر ایک ہلکی سی چپت لگائی۔

"بتاتا ہوں بابا بتاتا ہوں۔"

یہ دونوں باتیں کرتے ہوئے اوپر کی منزل پر آ گئے۔ رائے بہادر صاحب نے ان دونوں کو دیکھا۔ اور وہ چڑھتے ہوئے اپنے کمرے میں دبک گئے۔

"تم مجھے کتنا چاہتی ہو بمل"

"اپنی جان سے زیادہ جیا۔"

"اچھا تو میرا ایک کہا کرو گی ـــ؟"

"ہوں ـــ!"

"اچھا تو کھاؤ تو میری قسم۔"

"آپ کی قسم کی کیا ضرورت۔ کیا آپ کو مجھ پر اعتبار نہیں جیا۔"

"یہی سمجھ لو، تھوڑی دیر کے لئے۔"

"اچھا تو آپ کی قسم۔"

"کیا ـــ؟"

"یہی کہ آپ مجھے جو حکم دیں گے۔ میں اسے پورا کرونگی"

"یوں نہیں" جیون نے بملا کو بغور دیکھا۔

"میرے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاؤ"

"تو یہ ہے بھیا ——" بملا نے چیں بہ جبیں ہو کر کہا۔

"آج آخر اتنی بے اعتمادی کیوں ہے"

"بس ہے"

"اچھا تو آپ کے سر کی قسم بھیا" بملا نے جیون کے سر پہ ہاتھ رکھا۔

"آپ کا حکم میرے سر آنکھوں پر ہو گا"

"تو میری اچھی بہن" جیون کی آواز گلوگیر ہو گئی۔

"میرے کہنے سے تمہیں اپنی شادی وہاں کرنی ہو گی جہاں میں چاہوں گا"

اور جیون کے منہ سے یہ بات سنکر بملا سناٹے میں آ گئی۔ اس کے ہاتھ کے طوطے اُڑ گئے۔ سر چکرا گیا۔ اسکا۔ اور وہ پھٹی پھٹی نظروں سے اپنے بھائی کو دیکھنے لگی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

"بھیا!"

مارے رنج اور صدمہ کے اسکی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"میں تمہارے ہاتھ جوڑتا ہوں بمل، اپنے بھائی کی لاج رکھ لو"

"آپکی لاج کے لئے میں اپنی جان دے سکتی ہوں بھیا۔ مگر ——"

بملا ہچکیوں سے رونے لگی۔ اور جیون اس کی پیٹھ تھپکنے لگا۔

"یہ ایک بڑی عجیب بات ہے۔ بمل" جیون کی آواز بھرا رہی تھی۔

"میں ایسی بات تم سے کبھی نہ کہتا۔ مگر تم سمجھ لو کہ میں جیسے مجبور ہو گیا ہوں۔ ایک ایسی ہی بات ہے۔"

"کیا بات ہے ایسی ——؟" بملا کے ہونٹ پھڑک رہے تھے۔

"اگر تم نے کہا نہ مانا تو پاپا کی زندگی سے ہم دونوں کو ہاتھ دھونا پڑیگا۔"

"وہ کیسے بھیا —— !"

"پاپا کی شادی وہاں جبھی ہو سکتی ہے جب تمہاری شادی چودھری کے دوست کے بیٹے سے کر دیں۔ اس دوست کے بیٹے سے جس کا باپ وکیل تھا کبھی اور جسے چودھری نے اپنی سگی اولاد کی طرح پالا ہے۔ اور جو اس وقت شہر کے کسی کالج میں ایم۔اے کا طالبعلم ہے۔ شریف ہے۔ تندرست ہے اور ایک اچھے خاندان کا چشم و چراغ ہے۔"

جیون یہ سب کہتا رہا اور بملا اسے ایک ٹک دیکھتی رہی۔ بالکل گم سُم اور بے حس و حرکت جیسے کہ اسکا دماغ ماؤف ہو گیا ہو۔ جیسے کہ وہ کھو گئی ہو کہیں۔ آنسو اس کی آنکھوں میں خشک ہو گئے تھے۔

"مجھے منظور ہے۔"

بملا ایک زندہ لاش کی طرح اپنی جگہ پر سے اُٹھی اور کھوئے ہوئے انداز میں چل کر اپنے کمرے میں پہنچ گئی۔ اندر سے کمرے کا دروازہ اس نے بند کر لیا۔

جیون نے چودھری سے یہ بات جاکر کہدی کہ وہ اپنی بہن کی شادی اس کے منہ بولے بیٹے سے کرنے کو تیار ہے۔ وہ شادی کے انتظامات شروع کرے۔ اور پھر دونوں طرف سے شادی کے انتظام شروع ہو گئے۔ تاریخ مقرر کر دی گئی۔ طے یہ ہوا کہ چودھری بیٹے کی شادی شہر سے کرے گا۔

آج سے ٹھیک دو دن بعد بملا کا بیاہ تھا۔ اور پھر اس کے دوسرے دن رائے صاحب کی شادی تھی۔

"نہ جانے تم لوگ کیا کر رہے ہو" رائے بہادر سراسیمگی کے عالم میں بولے۔

"بملا راضی ہے اس شادی پر"؟

"جی — ہاں" جیون نے بڑا مختصر سا جواب دیا۔

"مگر لڑکا ہے کون"

"کہہ تو چکا ہوں کہ وہ میرا بڑا گہرا دوست ہے۔ ایم۔ اے میں پڑھتا ہے۔ اچھے خاندان کا ہے۔ اور بملا اسے پسند بھی کرتی ہے"

اور جیون کا یہ جواب سنکر رائے بہادر صاحب گڑبڑا کر چپ ہو گئے۔ اور وہ چونکہ اپنے معاملہ میں پہلے ہی سے چور بن چکے تھے۔ لہذا وہ کچھ کہہ سن بھی نہ سکے اور سب کچھ وہی ہو رہا تھا جو جیون چاہتا تھا۔ اس کی مرضی کے آگے کسی کو دخل نہیں تھا

"مگر میں یہ شادی ہرگز نہ کروں گا۔"

"کیوں نہ کروگے؟" چودھری نے اپنے منہ بولے بیٹے کو سمجھایا۔"

"جانتے ہو جاگیردار کے گھر شادی ہو رہی ہے تمہاری۔ بہت بڑے گھرانے ہیں۔ بھاگ کھل گئے ہیں تمہارے۔"

"جاگیردار کی لڑکی ہو یا شہنشاہ کی مجھے قطعاً منظور نہیں ہے۔"

"کیا اسی دن کے لئے میں نے تمہیں پال پوس کر اتنا بڑا کیا تھا۔ کیا اسی لئے میں نے تمہیں پڑھایا لکھایا تھا کہ ایک دن تم میری ہی عزت لینے پر آمادہ ہو جاؤ۔"

چودھری گرجا —

"جانتے ہو میں بات پکی کر چکا ہوں۔ اور تم پر احسانات ہیں میرے۔ اگر مرنے والے دوست کی نشانی سمجھ کر میں تمہیں نہ پالتا تو بھگوان جانے آج تم کہاں اور کس حال میں ہوتے۔"

"تو آپ اپنے احسان کا بدلہ چاہتے ہیں۔"

"یہی سمجھ لو —"

"اچھا —! تو میں تیار ہوں۔"

نوجوان کی مٹھیاں بھینچ گئیں۔ اور اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا —

رائے بہادر صاحب کی کوٹھی پر آج بڑی چہل پہل تھی۔ دوست اعزاز اپنے پرائے بھی جمع تھے۔ آج ان کی بیٹی بملا کا بیاہ تھا۔ رائے بہادر صاحب کے دور رشتہ کی اُنکی بہن شکنتلا بھی موجود تھی۔ اور سچ پوچھو تو اسے بملا کی شادی سے زیادہ اپنے بھائی کی شادی کی خوشی تھی۔ اس بھائی کی شادی تھی اس کے جس کی شادی پر وہ ایک بار ضرورت سے زیادہ زور بھی دے چکی تھی۔

ایک بے جان مجسمے کی طرح بملا لگن منڈپ میں لائی گئی۔ وہ آگر اگنی دیوی کے سامنے اپنے ہونے والے دولھا کے برابر بیٹھ گئی۔ مارے غصے اور رنج کے اس نے ایک بار بھی اپنے دولھا کی طرف نہیں دیکھا۔ اور یہی حال اُسکے دولھا کا بھی تھا

اس نے بھی آنکھ اُٹھا کر اپنی دولہن کو دیکھنے کی ضرورت نہ سمجھی۔

اور جیون چپ چاپ چور بنا ہوا یہ منظر بغور دیکھتا رہا۔ رائے بہادر صاحب کنیا دان کے لئے آئے۔ مگر بالکل اداس اور افسردہ ــــ جیسے کہ وہ بھی اپنی بیٹی کی اس شادی پر دل سے خوش نہ ہوں۔

پھیرے لگنے شروع ہوئے ــــ اور پھیرے ختم ہو گئے۔ پنڈت کے مقدس بھجن کی بھن بھناہٹ ختم ہو گئی۔ اور پھر مبارک سلامت کا شور بلند ہوا۔

شادی ہو گئی۔ اور بملا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنی مرضی کے خلاف کسی ایسے شخص کے دامن میں باندھ دی گئی ــــ جسے وہ دل سے قطعاً پسند نہ کرتی تھی۔ جس کے لئے اس دل کے کسی بھی گوشہ میں شمہ برابر بھی کوئی جگہ نہ تھی۔

مگر وہ باہمت لڑکی تھی۔ وہ بات کی دھنی تھی اور وہ محض اپنے پیارے بھائی کی دردمندانہ درخواست پر، اپنے باپ کی خوشی کی خاطر ہنستے کھیلتے شادی کی اس قربان گاہ پر بھینٹ چڑھ گئی۔

رائے بہادر صاحب کی آنکھوں سے زار و قطار آنسو بہہ رہے تھے اور روتے روتے انکی ہچکیاں بندھ گئیں۔ اور جیون رنج و غم کی انتہا نہ ہو سکنے کے باعث بالکل خاموش تھا۔ اتنا اداس جتنا کہ کسی ویرانے کا سناٹا۔ جیسے کہ کوئی جان بوجھ کر اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارے۔ جیسے کہ کسی دیوانے نے محض اپنے دیوانے پن کی بنا پر کنارے کے قریب پہنچ کر اپنی کشتی خود آپ ڈبو دی ہو۔

رخصت ہوتے وقت بملا اس سے دیوانہ وار لپٹ گئی۔ وہ زار و قطار رو رہی تھی۔ وہ پچھاڑیں کھا رہی تھی۔ اور پھر اس سے علیحدہ ہوتے ہوئے ہچکیوں کے ہجوم میں اس نے کہا۔

"بھیا۔ میں نے تمہاری قسم پوری کر دی ہے اور تم گواہ رہنا کہ میں نے اپنے باپ کی خوشی کی خاطر، بغیر کسی حیل و حجت کے، خود کو قربان کر دیا ہے۔۔۔"

اور پھر بملا رخصت ہو گئی۔ اور جیون اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا دل پکڑ کر بیٹھ گیا۔

رات کے ڈھائی بج چکے تھے۔ اور بملا دلہن بنی ایک چھوٹے سے کمرے میں کھڑکی کے پاس کھڑی سوچ رہی تھی کہ نہ جانے میرا تار پا کر منوہر کی کیا حالت ہوئی ہوگی کیا بیتی ہوگی اس پر۔ اور یہ سوچ کر کہ اس نے بڑے وعدوں کے بعد بھی منوہر کا دل توڑا۔ وہ رو پڑی۔ اس نے سوچا کہ اس نے کسی قیمت پر بھی اس غریب پر اتنا بڑا ظلم کر کے اچھا نہیں کیا۔ کاش! وہ اپنے بھائی کی قسم نہ کھاتی کاش اس نے پہلے سے یہ بات سوچی ہوتی۔ کہ نہ جانے کیا کہے گا۔ اسکا بھائی۔ وہ اپنے آپ پر نفرین کر رہی تھی۔ اس نے دل سے اپنے آپ کو کوسا۔

وہ سوچنے لگی کہ اپنے باپ پر اپنی محبت قربان کر کے اس نے کچھ اچھا نہیں کیا شاید اور ابھی وہ یہ باتیں سوچ ہی رہی تھی کہ بھڑ سے دروازہ کھلا۔ جیسے کہ کسی نے باہر

سے زبردستی اس کے شوہر کو اندر دھکیل دیا ہو۔
اس نے یکبارگی پیچھے گھوم کر دیکھا۔ ان دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں اور بیک وقت دو آوازیں ایک ساتھ ٹکرائیں۔

"منوہر ـــــ"

"بملا ـــــ"

اور پھر دوسرے ہی لمحہ وہ دوڑ کر دیوانہ وار ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔

"یہ کیسا مذاق ـــــ؟"

دونوں کی آوازیں پھر ایک ساتھ ٹکرائیں۔

"تو کیا آپ ـــــ!"

"جی میں ہی چودھری صاحب کا منہ بولا بیٹا ہوں۔

"مگر ـــــ"

"جی! میں ہی ہوں رائے بہادر صاحب جاگیردار کی بیٹی"

"مگر یہ ہوا کیسے ـــــ!"

دونوں آوازیں ایک بار پھر ایک ساتھ ٹکرائیں۔

"معلوم ہوتا ہے کہ ہماری محبت کی ڈور اتنی کمزور نہیں تھی کہ حادثات کی زد میں آکر وہ ٹوٹ جاتی"

"میں تو چودھری کاکا کی بات مان ہی نہ رہا تھا" منوہر بولا۔
"مگر تمہارے تار نما خط کی قسموں سے کہ تم اپنی شادی ضرور کر لینا میں مجبور ہو گیا تھا۔ اور ادھر کاکا جو اپنے احسانات کی فہرست گنوانے لگے۔ تو مجھے غصہ آ گیا۔

اور ہیں نے جیتی جاگتی خودکشی کی قسم کھا لی۔

"اور یہاں بھی یہی ہوا ―" بملا کہہ رہی تھی۔

"میں نے اپنے باپ کی عزت اور بھائی کی قسم پر زندہ در گور ہو لی تھی۔"

"مگر ہم نے بچے خوب۔"

"اچھی قسمتیں کبھی کبھی اس قسم کے معجزے دکھاتی ہیں۔"

"بھئی آج تو ہیں قسمت اور ایشور دونوں کو مان گیا۔"

منوہر نے بڑے پیار سے بملا کی ٹھوڑی اوپر اٹھائی۔ دونوں کی نظریں چار ہوئیں۔ اور بملا نے منوہر کی کچھ کہتی ہوئی نظروں کی تاب نہ لا کر اپنی پلکیں نیچے جھکا لیں۔

سنجوگ بلک بلک کر رو رہی تھی۔ اور اس کا باپ سے سمجھا رہا تھا۔

"کیسی نادان ہے تو میری بچی جو اس شادی سے انکار کر رہی ہے۔ ہمارے تو بھاگ کھل گئے بیٹا۔ کہاں ہم اور کہاں اتنی بڑی جاگیر کے مالک رائے بہادر صاحب یہ تو ایشور کی دین ہے بیٹی۔ وہ جب دینے پر آتا ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔"

"نہیں بابا۔ ایشور کے لئے تم مجھ پہ ترس کھاؤ۔ میں اپنا بیاہ نہ کروں گی۔"

اور وہ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"اگر ایسا ہی ہے تو تم مجھے گلا گھونٹ کر مار ہی کیوں نہیں دیتے۔"

"ارے پگلی!" چودھری بلبلا کر بولا۔

"یہ دیکھ! یہ کاغذ تو دیکھ۔ میں نے تو تیرے لئے پہلے ہی سے سوچ سمجھ کر سب کام پکا کر لیا ہے۔ دیکھ یہ کاغذ اس میں لکھا ہے کہ رائے بہادر صاحب کی شادی پر جاگیر تیری ہو گی۔ خود چھوٹے سرکار نے یہ سب عدالت کے سامنے لکھوا کر یہ کاغذ مجھے دیا ہے۔"

"نہیں بابا مجھے یہ سب کچھ نہیں چاہیئے۔ سنجوگ ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی۔

"مجھے جاگیر نہیں چاہیئے"

"پھر کیا چاہیئے تجھے ——؟" چودھری بگڑ کر بولا۔

"میں شکاری کو چاہتی ہوں" سنجوگ بپھر کر بولی۔

"چاہے تم مار ڈالو مجھے بابا۔ مگر اس وقت میں تم سے صاف صاف کہتی ہوں کہ میں شکاری سے پریم کرتی ہوں۔ اور اسے چھوڑ کر میں کسی سے وواہ نہ کرونگی"

"شکاری —!" چودھری کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔

"کون ہے یہ شکاری —" اس نے سنجوگ کے منہ پر ایک زور کا طمانچہ لگایا۔

"خبردار جو اب زبان کھولی" وہ دانت پیس رہا تھا۔

"میں تیری جیب کاٹ لوں گا۔ کمینی کہیں کی۔ لاج آتی ہے تجھے۔ یہ رات دوارے کھڑی ہے اور تو پریم پریم کی رٹ لگائے ہوئے ہے۔ ڈوب مر جا کر ناشدنی"

چودھری رونے لگا۔

"میں کہیں منہ نہ دیکھا سکوں گا —— سارا گاؤں۔ ساری برادری اور ساری دنیا تھوکے گی میرے منہ کے اوپر"

چودھری اپنا منہ پیٹنے لگا۔

"تو پیدا ہوتے ہی کیوں نہ مر گئی۔ کیا اسی دن کے لئے میں نے تجھے اپنی چھاتی سے لگا کر پالا تھا۔ کیا یہی دکھانے کو تو جوان ہوئی تھی" اس نے آخری بار سنجوگ کو دیکھا۔

"بس اب چپ کر، بات بہت آگے بڑھ چکی ہے۔ اب تیرے بلبلانے سے کچھ نہ ہوگا۔ پانی سر سے اُوپر آگیا ہے"۔

"بابا۔ میں تمہارے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ مجھ پر دیا کرو"۔ سجوگ بڑی بیقراری سے بولی۔

"کیا تم میرے بابا نہیں ہو۔ کیا میری طرف سے تمہارا خون بالکل سفید ہو گیا ہے۔ میں تمہاری بیٹی ہوں بابا۔ تم۔ آج سب کچھ ہو میرے۔ بابا تم میری آنکھوں میں جھانک کر کیوں نہیں دیکھتے۔ کیوں اپنے ہاتھوں سے میری جیتی جاگتی چتا تیار کر رہے ہو"۔

سجوگ اتنے درد کے ساتھ بلک کر روئی کہ چوہدری کا دل ڈوبنے لگا۔ اُسکے اوسان خطا ہو گئے۔ اور قریب تھا کہ وہ اپنی بیٹی سے کہدے کہ اچھا بیٹی تو غم نہ کر، میں نہ ہونے دوں گا۔ تیرا بیواہ۔

کہ اتنے میں باہر سے آدمی آ گئے۔ اور ایک شخص اندر کمرے میں جا کر بولا۔

"کیا کر رہے ہو چوہدری! جلدی چلو۔ بیٹا کو لیکر۔ باہر لگن منڈپ میں انتظار ہو رہا ہے۔ لگن کا مہورت نکل جائے گا"!

"ایں" ہے، چوہدری کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا اور پھر وہ اپنے ہوش و حواس جمع کر کے بولا۔

"اچھا اچھا! تم لوگ چلو! میں بٹیا کو لے کر آتا ہوں۔

اور پھر وہ سجوگ سے بڑی خوشامد اور ملائمت سے بولا۔

"بٹیا۔ لاج رکھ لے اپنے بوڑھے بابا کے ان سفید بالوں کی۔ مجھے دکھ ہے۔ مگر کیا کروں بٹیا کہ اب بات میرے بس سے باہر ہو چکی ہے۔ بڑی جگ ہنسائی کریگا۔ جاگیر دار اپنے ارمان کا بدلہ ہم دونوں کے خون سے ہولی کھیل کر لیگا۔

"بابا۔۔۔"

دل کی انتہائی گہرائیوں سے ایک سرد آہ کے ساتھ یہ لفظ سنجوگ کی بساتھ تھرتھراتے ہونٹوں سے باہر آ گیا۔

"پھر وہی بات ——"

چودھری نے جیسے اپنے کانوں میں روئی ٹھونس لی ہو۔ اسے اپنی بیٹی کی بسر فریاد کی طرف سے اپنے کان بہرے کر لئے۔ اور وہ سنجوگ کو زبردستی گھسیٹتا ہوا باہر تک لے گیا۔

"دیا کرو بابا —— رحم کرو بابو"

بڑی بیقرار نگاہوں سے سنجوگ نے چودھری کو دیکھا اور چودھری نے اپنے ہونٹ بھینچ کر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

جیون سنجوگ کی بہاڑی پر ڈھونڈ رہا تھا۔ اور سنجوگ لگن مندر میں اپنے باپ کے پہلو میں بیٹھی بھی زار وقطار رو رہی تھی۔ پتھروں سے اپنا سر ٹکرا رہا تھا۔ اور یہ یہاں اس ہجوم میں کھڑی ہوئی اپنی قسمت کو رو رہی تھی۔

وہ دلوانہ وار پہاڑی پر ادھر ادھر چکر لگا رہا تھا۔ اور یہ یہاں جنے پتی کے پلو سے بندھی ہوئی اگنی دیوی کے گرد پھیرے لگا رہی تھی۔

ایک باپ کے دِل کی کلی کھل گئی تھی — اور اسی کے بیٹے کے چمن کی ساری کلیاں مرجھا گئی تھیں۔

ایک کا دِل اُس کے پہلو میں مارے خوشی کے بلیوں اُچھل رہا تھا۔ اور ایک کا دِل غموں کے سمندر میں ڈوبا جا رہا تھا۔

کسی کے جوان ارمانوں میں مایوسیاں سمٹ آئی تھیں — اور کسی کے بوڑھے ارمانوں میں بہار آ گئی تھی۔ ایک کا گھر جل گیا تھا — اور دوسرا تاپ رہا تھا —

اور یہ قدرت کی ستم ظریفی تھی — اور یہ اسکے ادنیٰ کھیلوں میں سے ایک ایسا کھیل تھا۔ جس سے قدرت ہمیشہ اپنا دل بہلایا کرتی ہے۔

"کیا تم اپنی ماتا جی کا آشیرواد لینے نہ جاؤ گے؟"

شکنتلا (جیون کے رشتہ کی پھوپھی) نے جیون سے آکر کہا۔ جو باہر ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا صبح کا تازہ اخبار دیکھ رہا تھا۔

"کیوں نہیں جاؤں گا" جیون اخبار پر سے نظریں ہٹاتے ہوئے بڑی خندہ پیشانی سے بولا۔

"تو پھر آؤ"

"بہت اچھا"

وہ اٹھ کر شکنتلا کے ساتھ ہو لیا۔ اور شکنتلا نے اوپر کے کمرے کے سامنے لیجا کر بولی

"تم چلو! میں بہو رانی کے لئے ناشتہ لیکر آتی ہوں"

اور یہ کہہ کر شکنتلا چلی گئی۔ اور جیون نے دروازے کو دھکا دیکر اندر کمرہ میں قدم رکھا

نجوگ۔ اپنا تمتماتا ہوا چہرہ کھڑکی سے باہر کئے کھڑی تھی۔

اور قبل اسکے کہ جیون اسے "ماتا جی نمستے" کہہ کر اپنی طرف مخاطب کرے۔ اُسنے

آہٹ پاتے ہی گھوم کر پیچھے دیکھا۔

دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں۔ اور "ماتا جی" کے الفاظ جیون کے لبوں کے پاس آکر جم گئے۔ اُس کا سر چکرا گیا۔ اور بے ساختگی کے عالم میں سنجوگ کے منہ سے نکلا۔

"فنکاری ––– !"

اور جیون بدحواسی کے عالم میں پاگلوں کی طرح پیچھے بھاگا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے بےشمار ستارے ناچ رہے تھے۔ سینکڑوں رنگ ایک سیاہ گڈمڈ ہو کر اس کی بینائی پر چھا گئے۔ اور وہ سنگ مرمر کے طویل و طویل زینے پر سے بڑی تیزی کے ساتھ لڑھکتا ہوا۔ یکدم نیچے آکر گرا۔ اسکا سر پھٹ گیا تھا اور وہ اپنے ہی خون میں لت پت ہو کر بیہوش ہو گیا۔

دلکشن کلب پر سناٹا چھایا ہوا تھا پورا کلب جیون کی جشن ساماں آواز پر جھوم رہا تھا۔ اس کے نغمے فضا میں ہلچل مچا رہے تھے۔ وہ پورے کلائمکس پر پہنچ چکا تھا۔ پورے جوش و خروش کے ساتھ وہ گا رہا تھا۔ جوش میں آکر پورے ہال نے تالیاں بجانی شروع کر دیں۔ تالیوں کے ماحول سے پورا ماحول گونج اٹھا۔

جیون کی آواز ابھی اپنی پوری تان کو ختم نہیں کر سکی تھی کہ یکبارگی اسے جانے کیا ہو گیا۔ وہ چکرا کر اسٹیج سے نیچے گر گیا۔ اُس کی آواز یکبارگی درمیان میں سے ٹوٹ گئی۔ آرکسٹرا کی تانوں نے دم توڑ دیا۔ سارے میوزیشن گھبرا کر کھڑے ہو گئے۔ اور لوگ یکبارگی بے تحاشا اسکی طرف بھاگے۔ شہلا کی چیخ نکل گئی۔ وہ جیون کی طرف انتہائی تیزی سے لپکی۔ جیون بیہوش ہو چکا تھا۔

منیجر نے لوگوں کو ہٹایا۔ اور کئی آدمیوں نے مل کر اسے اٹھا کر ایک موٹر میں بٹھا دیا۔

وارڈ نمبرے میں جیون ایک لوہے کے صاف ستھرے پلنگ پر بے حس و حرکت لیٹا ہوا تھا۔ اسکے سر میں پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اور اس کی آنکھیں بند تھیں۔

اور اس کا ذہن اس کے ماضی کے تانے بانوں میں الجھا ہوا تھا۔۔۔۔۔۔

وہ اپریشن روم سے باہر لایا گیا۔ ہسپتال میں بھی موجود تھے۔ اسکے گھر کے تمام لوگ اور خود رائے بہادر صاحب بھی۔

"ڈاکٹر!" رائے بہادر صاحب گھگیا رہے تھے۔

"ڈاکٹر! تم میرے بیٹے کی زندگی مجھے واپس دلا دو۔ میں تمہیں انعام میں اپنا سب کچھ دیدوں گا۔ تم جو چاہنا انعام میں لے لینا۔ میں تمہارا منہ موتیوں سے بھر دوں گا۔"

"گھبرایئے نہیں۔" ڈاکٹر رائے بہادر صاحب کی چیخوں سے متاثر ہو کر بولا۔

"آپ کا بیٹا آپ کو ضرور واپس مل جائے گا۔ ہمارا اپریشن کامیاب ہوا ہے۔"

"ایشور آپکو جیتا رکھے ڈاکٹر۔ آپ نے یہ خوشخبری سنا کر میرے مردہ جسم میں روح پھونکدی ہے۔"

آج ہسپتال میں سبھی موجود تھے۔ رائے بہادر صاحب۔ بملا۔ منوہر۔ اور تمام دوسرے اعزاء احباب۔ اور ملازمین۔ آج جیون کے سر کی پٹی کھلنے والی تھی۔ وہ پٹی جس نے اس چہرۃ تک ڈھانپ رکھا تھا۔

ٹھیک دس بجکر دس منٹ کے اوپر ڈاکٹروں نے گھڑی دیکھی اور نرسوں کو پٹی کھولنے کا اشارہ کیا۔ اور نرسوں نے بڑی احتیاط کیساتھ پٹیاں کھولنی شروع کیں۔ پٹیاں کھل گئیں۔ ڈاکٹروں نے نظروں ہی نظروں میں معنی خیز انداز میں ایک دوسرے کو دیکھا۔

"بھیا۔۔! بملا۔ جیون کیطرف بڑھنے ہی والی تھی کہ ڈاکٹر نے روک دیا۔

عجیب کشمکش و پیچ کے عالم میں سب لوگ کھڑے تھے۔ ہر ایک کے چہرے پر گومگو کے تاثرات تھے۔ کہ یکبارگی اپنی پلکوں کو زور زور سے کھولتے اور بند کرتے ہوئے جیون چیخا

"ڈاکٹر۔۔! میری آنکھیں۔۔!!"

وہ پاگلوں کی طرح چلانے لگا۔

"ڈاکٹر میری آنکھیں۔۔ میری آنکھیں ڈاکٹر۔ میں اندھا ہوں۔ مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ میں اندھا ہو گیا ڈاکٹر۔۔"

وہ غشی کے عالم میں اپنے بستر پہ گر گیا۔ اور تمام لوگ اس کی طرف دوڑ پڑے۔ بملا چیخ چیخ کر رونے لگی۔ اور رائے بہادر صاحب کے ہوش اڑ گئے۔ سبھی متاثر تھے۔ پریشان تھے۔۔ اور سب کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔

"ڈاکٹر۔۔ یہ کیا ہوا ڈاکٹر۔ میرا بیٹا اندھا کیسے ہو گیا ڈاکٹر"

رائے صاحب ڈاکٹر کو بری طرح جھنجوڑ رہے تھے۔

"تم میری آنکھیں نکال کر میرے بیٹے کو دیدو۔ مگر اسے اچھا کر دو۔ اس کی کھوئی ہوئی بینائی اسے واپس کر دو۔ میں اپنا سب کچھ لٹا دوں گا۔ تم اگر چاہو تو میری کھال بھی اتار سکتے ہو۔"

"ڈونٹ وری" ڈاکٹر بولا "گھبراؤ مت"

حالانکہ اسکے اوسان خود خطا ہو گئے تھے۔ سارے ڈاکٹروں کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

شہر کے سب سے بڑے ہسپتال کے سب سے بڑے سرجن نے جیون کی آنکھوں کا معائنہ کر کے فیصلہ سنایا کہ آنکھوں کا اپریشن کیا جائے گا۔ اور سو فیصدی اس کی آنکھیں اسے واپس مل جائینگی۔

ایک ہفتہ کے بعد اپریشن کی تاریخ مقرر کی گئی۔

جیون نے اپنے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنی آنکھوں کا اپریشن نہیں ہونے دیگا۔ اس نے سوچا کہ اسے اب یہ آنکھیں بالکل نہیں چاہئیں۔ وہ بہادر اکیلے

اندھا ہی رہنا چاہتا تھا۔ وہ آنکھ کھول کر اب اس دنیا کو دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔
جس میں رہ کر اس پر اتنا ظلم ہوا تھا۔ وہ قدرت کے اس قسم کے مذاق پر سخت برہم تھا
وہ اپنی محبوبہ کو اپنی ماں کے روپ میں دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے دنیا سے نفرت ہو گئی
تھی۔ اور دنیا والوں سے چڑ ہونے لگی تھی اسے۔ البتہ اس نے بملا سے کہہ کر اپنے وارڈ
روب سے ایک پیکیٹ منگوا کر اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ وہ پیکیٹ جو اسے بیحد عزیز تھا۔
اسنے سوچا کہ یہ قدرت کی سب سے بڑی مہربانی ہے۔ اسکے اوپر کہ وہ اندھا کر
دیا گیا ہے۔ اور اب آخری بار وہ قدرت کی اس مہربانی سے محروم ہونا نہیں چاہتا تھا۔
لہٰذا ایک رات جبکہ کائنات پر گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ وہ چپکے سے رات کے ڈھائی
بجے ہسپتال سے باہر آ گیا۔ اور راستہ ٹٹول کر وہ کچھ دور تک پیدل چلتا رہا۔ کہ
اس کے کانوں میں کسی تانگہ کے گزرنے کی آواز آئی۔
اور وہ اُسے رکوا کر اُس پر سوار ہو گیا۔ اور سیدھا اسٹیشن جا پہنچا۔ اس
کی جیب میں ایک پرس تھا۔ اور یہ پرس جاری ہی تھا۔
اُس نے کلکتہ کا ایک ٹکٹ لیا۔ اور گاڑی پر سوار ہو گیا۔

کلکتہ پہنچ کر وہ ایک ہوٹل میں ٹھہرا۔ اور وہیں سے اس نے ہوٹل کے بوائے کے

ذریعہ کچھ ضروری سامان خرد وایا چنگ کا زمانہ تھا۔ اور وہ خداداد آواز کا مالک تھا۔
اسے فوراً ایک ٹورنگ امیوزنٹ پارٹی کے ساتھ سمندری سفر پہ دنیا کے
مختلف مقامات پر اپنے کمالات دکھلانے کے لئے بھیج دیا گیا۔

اور اس عرصہ میں اس نے تمام دنیا میں، اِدھر اُدھر اپنے کمالات کا مظاہرہ کیا۔
مڈل ایسٹ، مصر، اٹلی، انگلستان، ملایا، برما۔ زنجبار، فرانس، افریقہ
اور نہ جانے کہاں کہاں۔

اور پھر جب جنگ ختم ہو گئی۔ تو وہ نیروبی میں رہ گیا۔ نیروبی میں جہاں بہت
سے ہندوستانی آباد تھے۔ اور جہاں پہ اُس کا دل کافی سے زیادہ لگ گیا تھا۔

اور وہ یہاں نیروبی میں رہ کر کافی سے زیادہ مقبول اور ہردلعزیز ہو گیا تھا۔
اس نے مختلف کلبوں اور پارٹیوں میں اپنے کمالات کا مظاہرہ کیا۔

اور اب ادھر چند برسوں سے وہ مستقلاً ولنگٹن کلب کا ملازم تھا۔ اس کی رس
اور سوز میں ڈوبی ہوئی آواز صرف اسی کلب میں سنی جا سکتی تھی۔

اور اب وہ قدرے اپنی زندگی سے مطمئن تھا۔ اور اسے اپنی پچھلی زندگی کے
ناسوروں کو بھرنے کا یہاں رہ کر اچھا موقع مل گیا تھا۔

مگر وہ اپنے متعلقین کو اب بھی نہ بھولا تھا۔ اور اکثر جاگتے جاگتے وہ اپنی پچھلی
زندگی کے ان خوابوں میں کھو جاتا۔ جو کربناک بھی تھے۔ اور راحت رساں بھی
جن میں سوز بھی تھا اور ساز بھی۔

اور اُسکی یہ موجودہ زندگی اسی حال میں گذر رہی تھی۔ کہ اچانک یکایک
یہ شہلا نہ جانے کہاں سے ٹپک پڑی۔ جو بڑی سرعت کے ساتھ اس کی زندگی میں

گھل مل جانا چاہتی تھی۔

حالانکہ وہ ان باتوں کو پسند نہیں کرتا تھا۔ اُسے ان باتوں سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

جیون اپنے خیالات میں اسقدر کھویا ہوا تھا کہ شہلا کی آمد کی اسے مطلق خبر نہ ہوئی اور شہلا اس کے بالکل نزدیک پہنچکر بولی۔

"کس خیال میں کھوئے ہوئے ہیں آپ مسٹر جیون ۔۔؟"

اور شہلا کے اس اچانک تخاطب سے جیون کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔

اور وہ چونک کر بولا۔

"کچھ تو نہیں۔ یونہی چپ چاپ لیٹا ہوا تھا"

"نہیں کچھ تو ضرور آپ سوچ رہے تھے" شہلا اس کے پلنگ کے نزدیک رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"میں سوچ رہا تھا کہ آخر میں زندہ کیوں ہوں" وہ بجید خفا بانی بنکر بولا۔

"آخر دنیا میں میری ضرورت ہی کیا ہے ۔۔؟"

"کیسی باتیں کرتے ہیں آپ" شہلا بے چین ہو کر کہا۔

"آپ کی ضرورت کیا ہے۔ یہ آپ کو خود نہیں معلوم"

"میں آخر زندوں کے اس قبرستان سے کب باہر نکلوں گا"

شہلا مسکرائی۔

"کل ——! آج آپ کا اس ہسپتال میں آخری دن ہے"

"اور کل بھی اس لئے کہ آج تمہاری آنکھوں کا معائنہ ہوگا"

کوشلیا بولی جو کہ چپ چاپ جیون کے پاس آکر بیٹھ گئی تھی۔

"آپ ——! کون ہیں آپ؟"

"میری کوشلیا دیدی ——" شہلا نے جواب دیا۔

"آداب عرض!" جیون نے کوشلیا کو سلام کیا۔

"بڑی تکلیف کی آپ نے"

"تکلیف کیسی ——" کوشلیا بولی "اپنوں کی خبر گیری بھی کبھی تکلیف ہوئی ہے"

"شکریہ ——!"

"شکریہ ادا کر کے تم ہمیں اپنوں کے درجے سے گرانا چاہتے ہو"

کوشلیا مسکرائی۔

"کیوں ہے نہ یہی بات"

"جی بالکل نہیں" جیون محرومی کے احساس تلے دب کر بولا۔

"اتنی بڑی دنیا میں سوا آپ لوگوں کے میرا ہے ہی اور کون"

اور جیون کے اس جواب پر شہلا کا چہرہ کنول بنکر کھل اٹھا۔ اور وہ خوش ہو کر بولی۔

"تو اب تو آپ کو اس پر اعتراض نہیں ہے کہ ہم آپ کی آنکھوں کے اپریشن پر آمادہ کیوں دے رہے ہیں"

"کیا جیون کو اس پر اعتراض ہے" کوشلیا نے سوال کیا۔

"ہاں دیدی!" شہلا جیسے تنکا ٹیکتا بولی۔

"جیون صاحب نے ہمیشہ بڑی سختی کے ساتھ میری اس سب سے بڑی خواہش کو رد کیا ہے۔ انکا کہنا ہے کہ وہ اپنی آنکھوں کو اچھا کرنا نہیں چاہتے۔ تیرا نہیں یہ بات پسند نہیں کہ ہم ان کے لئے اتنی بڑی رقم کا خرچ برداشت کریں"

"یہ تو بہت بری بات ہے جیون صاحب" کوشلیا بڑی اپنائیت بھرے انداز میں بولی۔

"کہ آپ ہمارے اور اپنے درمیان روپیہ پیسہ کی دیوار کو حائل کرنا چاہتے ہیں۔ اور پھر آنکھوں کی نعمت سے محروم رہنے کی آپ کی یہ ضد سراسر فطرت پہ ظلم ہے! اور ایسی ضد کو تو میں سب سے بڑا پاپ سمجھتی ہوں"

وہ حکم لگاتے ہوئے بولی۔

"آپ کی آنکھوں کا اپریشن ہوگا اور ضرور ہوگا"

اور شہلا کی بڑی بہن کے اس حکم کے آگے جیون کی ہمت نہ ہو سکی کہ وہ انکار کی جرأت کر سکے۔ اور اس طرح ایک ایسی کوشش جو جیون شہلا کی کے درمیان عرصہ سے پڑی جھول رہی تھی کامیاب ہو گئی۔

جیون کی آنکھوں کا آپریشن بڑی کامیابی کے ساتھ ہو چکا تھا اور آج دن کے ساڑھے دس بجے اسکی آنکھوں کی پٹی کھلنے والی تھی۔ مارے خوشی کے شہلا کو رات بھر نیند نہیں آئی تھی۔ اور رات بھر اس نے دعائیں مانگی تھیں کہ ایشور کرے آپریشن کامیاب ہوا ہو۔ اور جیون کو اس کی کھوئی ہوئی دنیا پھر سے واپس مل جائے۔

صبح چھ ہی بجے سے شہلا ہسپتال پہنچ گئی۔ اور اس کے ساتھ اسکی ویدی کوشلیا بھی صبح ہی صبح ہسپتال میں موجود تھی۔

انتظار کی یہ گھڑیاں کاٹے نہیں کٹ رہی تھیں۔ شہلا بار بار اپنی کلائی پر بندھی ہوئی رسٹ واچ کو دیکھتی۔ آج وہ ایک ایک سیکنڈ گن رہی تھی۔ اور آج کا ایک ایک سیکنڈ اس کے لئے ایک ایک گھنٹہ کے برابر تھا۔ بار بار اس کا جی چاہتا کہ وہ گھڑی کی ان "سست رفتار" سوئیوں کو یکدم سے جھٹکا کر ساڑھے دس پر پہنچا دے۔

بارے خدا خدا کر کے ساڑھے دس بجے اور ڈاکٹروں نے جیون کی آنکھوں کی پٹی کھولنے کے انتظامات شروع کر دیئے۔ پٹیاں آہستہ آہستہ کھل رہی تھیں اور شہلا

کے دل کی دھڑکنیں بتدریج تیز ہوتی جا رہی تھیں اس کی آنکھیں جیون کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اور اس کا سارا جسم پسینے میں ڈوبا جا رہا تھا۔

اور جب جیون کی آنکھوں پر بندھی ہوئی ساری پٹیاں کھل گئیں۔ تو شہلا کا دل اس کے حلق میں آ کے پھنس گیا۔

جیون کی آنکھیں زور زور سے پھڑپھڑائیں۔ اور پھر اس کی پھڑپھڑاتی ہوئی آنکھوں کو قرار آ گیا۔ جیون کا وفادار ملازم راموں پاس ہی کھڑا تھا۔ مارے خوشی کے اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے تھے۔ کہ جیون یکبارگی زور سے چیخا۔

"ڈاکٹر۔ ڈاکٹر۔ میں نہیں دیکھ سکتا ہوں ڈاکٹر۔ میں دیکھ سکتا ہوں۔ میں سب کچھ دیکھ سکتا ہوں۔ پورا کمرہ میری نظر کے سامنے ناچ رہا ہے۔"

راموں مارے خوشی کے دوڑ کر جیون سے لپٹ گیا۔

"صاحب۔ میرے اچھے صاحب"

اور جیون راموں کی آواز پہچان کر بولا۔

"کون راموں۔"

اسنے بڑی محبت سے راموں کو بھینچ لیا۔

"صاحب۔ میرے صاحب"

راموں جیون سے لپٹا ہوا تھا۔ کہ اچانک جیون کی نظر شہلا پہ پڑی۔ جو مسرتوں کی انتہاؤں میں کھوئی ہوئی اس کے پاس ہی کھڑی تھی۔ اور اسے دیکھتے ہی جیون نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اور وہ چیخا

"کون سنجوگ۔"؟

"نہیں نہیں مجھے آنکھیں نہیں چاہئیں۔ میں روشنی نہیں چاہتا۔ مجھے اندھیروں میں ہی ٹھوکریں کھانے دو۔ بھٹکنے دو مجھے ان اندھیروں میں۔ ڈاکٹر۔ ایشور کے لئے میری بینائی مجھ سے چھین لو۔"

وہ پاگلوں کی طرح بکے چلا جا رہا تھا کہ یکبارگی رامو اسے جھنجھوڑ کر بولا — اس نے اس کے ہاتھوں کو اس کی آنکھوں سے ہٹا دیا۔

سنجوگ نہیں صاحب۔ یہ تو شہلا دیدی ہیں۔ شہلا دیدی! جنہوں نے آپکی آنکھیں واپس دلائی ہیں آپکو۔ جو آپ کے لئے ناشتہ تیار کرتی تھیں۔

"شہلا —"

جیون نے اپنی آنکھیں شہلا کے چہرہ پر مرکوز کر دیں۔

"جی —!" شہلا جیون کے قریب اس کے بالکل سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔

"میں شہلا ہوں" وہ بولی۔

"سنجوگ نہیں مسٹر جیون"

"شہلا —!" بڑی گرمجوشی سے جیون نے شہلا کا ہاتھ دبایا —

"معاف کرنا شہلا" وہ کہہ رہا تھا —

"آب سے دس برس پہلے کا ایک بھولا ہوا خواب مجھے نظر آ رہا تھا۔ اور اس خواب کو تم بالکل اتفاقیہ طور پر جیتی جاگتی تعبیر ہو۔"

"کیا میری صورت سنجوگ سے اتنی ملتی جلتی ہے ؟"

"ہاں شہلا —" جیون بولا —

"جیسے کہ آئینہ میں عکس"

"یہ بھی قدرت کا ایک مذاق ہے۔" کوشلیا بول پڑی۔

اور شہلا نے تعارف کرایا۔

"آپ کوشلیا دیدی ہیں۔"

"آوارہ پہچان لیا میں نے۔" جیون بولا۔

"ویسے آپ کی بدولت آنکھیں مل جانے پر آج آنکھوں سے بھی دیکھ کر تعارف ہو گیا۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو تم جیون۔"

کوشلیا بڑے پیار سے بولی۔

"یہ بدولت کا بوجھ نہ رکھو میرے کندھوں پر۔ اس لئے کہ میں بوجھ اٹھانے کی عادی جو نہیں ہوں۔"

مسرتوں کا ایک سوتا تھا جو پھوٹ پڑا تھا۔ اور یہ سب مسرتوں کے اسی سوتے میں بہے چلے جا رہے تھے۔

آنکھیں بھیون کو ملی نہیں۔ اور مسرتوں سے ان گنت تارے شہلا کی آنکھوں میں جگمگانے لگے تھے مسرتوں کی اتنی بے اندازہ فراوانی اس کی زندگی میں اس سے پہلے اسے کبھی نصیب نہ ہوئی تھی وہ دن بھر بھیون کو ادھر ادھر لئے لئے پھرتی باغوں کلبوں۔ پارکوں اور تفریح گاہوں کا کونا کونا وہ بھیون کو جھنکاتی پھر رہی تھی سیر و تفریح۔ سینما۔ تھیٹر۔ پکنک پارٹی، اسپورٹس۔ کھیل۔ تماشے، سرکس۔ غرضیکہ ہر جگہ وہ اسے لئے لئے پھری۔

پورا نیروبی اس نے اسے گھما دیا۔ اور پھر دور دراز جگہوں کی سیاحتیں بھی ہوئی۔ ریل، ہوائی جہاز اور موٹر کار۔ وہ ہر جگہ ایک دوسرے کے ساتھ بھاگے بھاگے پھرے۔ اس نے اسے اپنے کاروبار کے دفاتر بھی دکھائے اور بھیون کو یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی اور بڑا تعجب ہوا کہ ان دونوں بہنوں کا کاروبار دنیا بھر کے ملکوں سے ہوتا تھا۔ انکے دفاتر امپورٹ اور ایکسپورٹ کے مرکز بنے ہوئے تھے۔

اور یہ سارا کاروبار ایماندار اور تجربہ کار ملازموں کے سپرد تھا۔ جن کی دیکھ بھال کی ساری ذمہ داری شہلا کی بڑی بہن کوشلیا سنبھالے ہوئے تھی۔

ان دونوں کے پتا جی ایک بہت بڑے کاروباری تھے۔ اور عرصہ ہوا ہندوستان چھوڑ کر یہ مستقلاً نیروبی میں آکر مقیم ہو گئے تھے۔

شہلا کی ماں کا انتقال عرصہ ہوا ہندوستان میں ہو چکا تھا۔ اور انکے پتا جی ابھی دو برس ہوئے سورگباش ہو گئے تھے۔ اور ان دونوں بہنوں کے علاوہ ان کا اور کوئی قریب کا عزیز رشتہ دار نہیں تھا۔ نہ کوئی بھائی اور نہ کوئی بہن۔

"ایک بات کی بڑی خوشی ہے مجھے"

"کس بات کی؟" شہلا نے کپ میں دودھ ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے اس گلے بازی سے نجات مل گئی"

جیون بولا۔

"مجھے ہمیشہ اپنے اس پیشے سے کوفت ہوتی رہی ہے مگر کیا کرتا زندہ تو رہنا ہی تھا کسی نہ کسی طرح"

"آپ کو گانے سے نفرت ہے؟"

"گانے سے نہیں بلکہ گانے کو پیشہ بنا لینے سے" جیون نے کہا۔

"مگر کیا کرتا۔ آنکھیں خراب کیسے ہو گئیں"

اور شہلا کے اس اچانک سوال پر جیون کچھ پریشان ہو گیا۔

"یہ میرے لئے بڑا مشکل سوال ہے" جیون معذرت بھرے انداز میں بولا۔

"اگر آپ میری پچھلی زندگی کے متعلق مجھ سے کوئی سوال نہ کریں تو ——"

"مجھ سے غلطی ہوئی ——"

شہلا نے جیون کی بات کاٹی۔

"آئندہ سے میں ایسی کوئی بات نہ پوچھوں گی آپ سے جس سے آپ کو تکلیف

ہو ——"

"ہاں ——!" جیون خلاؤں میں گھورنے لگا۔

"پچھلی باتوں کو دہرانے سے کیا حاصل"

اس نے ایک بڑی طویل اور سرد آہ کھینچی۔

"اب میں کسی معقول جگہ کے لئے درخواست دوں گا۔

"یہ کیوں ۔۔۔؟"

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے" جیون مسکرایا۔

"زندہ رہنے کے لئے"

"اگر ایک درخواست میں کروں آپ سے"

"وہ کیا ۔۔۔"

"کہ آپ کو کسی جگہ درخواست دینے کی ضرورت نہیں ہے"

اور اتنی ہی سی دیر میں جیون نے نہ جانے کہاں کھو گیا۔ اور شہلا کی بات کا اسے کوئی جواب نہ مل سکا۔ شہلا چپ رہی اور اس نے جیون کے اس کھوج کا پتہ لگانے کی کوشش کی۔

بہت دیر ہو گئی اور شہلا نے اس کے خیالات کا سلسلہ توڑ دیا۔

"کیا سوچ رہی ہیں آپ؟"

"آج کل نہ جانے کیا ہو گیا ہے مجھے"

جیون محویت کے عالم میں کہہ رہا تھا۔

"ہر وقت اور ہر لمحہ پاپا اور اپنی پیاری سی بہن کی یاد مجھے ستایا کرتی ہے۔ نہ جانے وہ کیسے ہوں گے"

"کیا آپ کو انکی کوئی خبر نہیں ہے؟"

اور شہلا کے اس سوال پر جیون چونک پڑا۔ اس کی محویت ختم ہو گئی اور وہ گڑبڑا کر بولا۔

"ارے! حد ہو گئی۔ نہ جانے بے خیالی میں کیا کیا بکنے لگا"

جیسے کہ وہ شہلا سے اپنی کہہ گزرنے والی باتوں کو چھپانا چاہتا ہو۔ اور پھر وہ چائے کی پیالی کی طرف متوجہ ہوا۔

"ارے — یہ تو ٹھنڈی ہو گئی"

وہ چائے کے چمچے سے کھیلتا رہا۔ اور شہلا اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ میں غوطے کھاتی رہی۔

"دیکھئے مسٹر جیون، کل آپ میرے غریب خانہ لنچ پر مدعو ہیں"
شہلا نے آتے ہی جیون کو حکم سنایا۔

"یہ کس خوشی میں صاحب" جیون نے کتاب ایک طرف رکھ دی۔

"کل صبح کے پلین سے میری بہن جی آرہی ہیں"

"کہاں سے؟"

"ہندوستان سے"

اور ہندوستان کا نام سنکر جیون کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوگئی۔

"میں ضرور آؤں گا" جیون بولا۔

"کم از کم وطن سے آنے والی ایک ہستی کے درشن تو ہو ہی جائیں گے"

"ایک نہیں چھ—" شہلا مسکرائی۔

"بہن جی کے ساتھ۔ ان کے چار بچے اور جیجا جی بھی ہوں گے"

"یہ کون سی بہن ہے آپ کی؟"

"دیدی کی منہ بولی بہن۔ انہیں کے کالج میں کبھی پڑھتی تھیں۔ ہم لوگوں میں سگے سے زیادہ پریم ہے۔"

"میں ضرور آؤں گا۔"

"اچھا تو اب میں چلی۔"

اور جیون نے منہ اٹھا کر شہلا کو دیکھا۔ اور اس نے سمجھا کہ جیسے جیون کی نظریں اس سے پوچھ رہی ہوں کہ "اتنی جلدی؟"

اس نے جواب دیا۔

"کل کے سواگت کی تیاریاں جو کرنی ہیں۔"

اور یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ جیون دوبارہ کتاب کے مطالعہ میں مشغول ہو گیا۔

"آیئے صاحب آیئے۔"

شہلا اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی۔

"تشریف رکھیے۔ بہن جی ابھی آرہی ہیں۔ وہ ذرا دیدی کے ساتھ باہر گئی ہیں۔ جیجا جی بھی ساتھ ہیں۔"

"اور یہ کون صاحب ہیں؟" جیون نے ایک کمسن بچے کو آیا کی گود سے لیتے ہوئے پوچھا۔

"یہ ہماری بہن جی کے سب سے چھوٹے صاحبزادے ہیں" شہلا نے گویا تعارف کرایا۔

"اور آپ کا نام ہے سنتوش!"

"بھئی واہ — !" جیون نے بچے کو اپنے کلیجے سے لگاتے ہوئے کہا۔

"بڑا پیارا بچہ ہے"

اس نے پیار کرکے بچے کو آیا کے سپرد کر دیا۔

"اور بچے کہاں ہیں آپ کی بہن جی کے"

"وہ بھی ساتھ گئے ہیں"

"ہوں ——"

اور جیون ابھی شہلا سے کوئی دوسری بات کرنے جا ہی رہا تھا کہ اتنے میں باہر کار کے رکنے کی آواز آئی۔

"لیجئے وہ لوگ آ بھی گئے"

شہلا باہر بھاگی اور جیون ہمہ تن انتظار بن گیا۔ چند سیکنڈ بعد وہ لوگ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔

"بہن جی آپ ان سے ——"

شہلا نے صرف اتنا ہی کہا تھا کہ جیون کی نظریں "بہن جی" سے چار ہوئیں۔ اور وہ دونوں ایک لمحے کے لیے سکتے میں آ گئے۔

اور پھر بہن جی بے اختیار "بھیا" کہہ کر جیون سے لپٹ گئیں اور جیون تمری بل ۰

کہہ کر اُن سے ہم آغوش ہو گیا۔ دونوں کی آنکھوں سے گنگا اور جمنا پھوٹ پڑیں۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر لپٹے ہوئے زار و قطار روتے رہے۔

روتے روتے دونوں کی ہچکیاں بندھ گئیں —— پورے ماحول پر سکوت طاری تھا۔ کوشلیا اور شہلا حیران و ششدر کھڑی اس منظر کو بغور دیکھ رہی تھیں۔ اور ایک دوسرے کا منہ تک رہی تھیں۔

"بھیا —!" بملا ہچکیوں کے درمیان اسی طرح جیون کے شانوں سے لگے ہوئے بولی۔

"آپ کہاں کھو گئے تھے۔ کیا اتنے دنوں میں کبھی اپنی بدنصیب بہن کا خیال بھی آپ کو نہ آیا؟"

"میری بہن —— میری بمل" جیون مسلسل روئے جا رہا تھا۔

"جانتے ہو آپ کے غم میں پاپا کیا حال ہوا۔ بیچارے پاپا۔ وہ آپکے گم ہونے کا صدمہ برداشت نہ کر سکے۔ اور ایک ہفتہ کے اندر ہی چل بسے اس دنیا سے"

"بمل —!" جیون بڑی زور سے چیخا۔ اور اس نے بملا کو شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔

"کیا کہہ رہی ہو تم ——"

"ہاں بھیا ——" وہ بیقرار ہو کر بولی۔

"پاپا چل بسے"

اور جیون پر غشی کی کیفیت طاری ہو گئی۔ آگے بڑھ کر شہلا اور منوہر نے لڑی

مشکلوں سے اسے سنبھالا۔

"بھابی صاحب! "منوہر نے جیون کو تسلی دی۔

"ہونی گزر گئی۔ آپ اپنے کو سنبھالئے۔ یہی خوشی کیا کم ہے۔ ہمارے لئے کہ ایک مدت کے بعد آپ مل گئے۔ اور ہم لوگوں نے آخر کار زندہ و سلامت ایک دوسرے کو دیکھ لیا!"

"مت روئے بھیّا "۔ اب بملا جیون کو تسلی دے رہی تھی۔ گذر گئی جو گزرنی تھی "۔

"اور ۔۔۔ اور ۔۔۔"

اور آگے جیون کچھ نہ کہہ سکا کہ بملا سب کچھ سمجھتے ہوئے بولی۔

"بیچاری ماتاجی ۔۔۔! آپکی آنکھیں جاتی رہنے کی خبر کے ساتھ ہی ایک آہ! کیا تھ وہ بھی سدا کے لئے اسی لمحہ چل بسیں۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ شدید صدمہ کی تاب نہ لاکر اُن کا ہارٹ فیل ہوگیا تھا۔

"اُف ۔۔۔!" ایک طویل آہ کے ساتھ جیون بیہوش ہوگیا۔

شہلا کی جان نکل گئی۔ بملا رو پڑی۔ اور پھر اسی وقت فون کرکے کوشلیا نے نیر و بی بھر کے ڈاکٹروں کو جمع کرلیا۔

بڑی دیر کے بعد جیون کو ہوش آیا۔ اور لوگوں کی جان میں جان آگئی۔ یکے بعد دیگرے اس کے کئی انجکشن لگائے گئے تھے۔

اور اب ہوش آجانے کے بعد بھی اسے ایک انجکشن اور دیا گیا۔ اور تب کہیں جاکر اطمینان کا سانس لیا۔ ڈاکٹر رخصت ہوگئے۔

اور پھر بہت دیر کے بعد اس غمناک ماحول میں سکون و اطمینان کی لہر پیدا ہوئی

"بھیا ——!" امبلا کہہ رہی تھی۔

"آج ہم لوگوں کو وطن چھوڑے پورے بیس دن ہو چکے ہیں۔ اور اب ہمیں گھر واپس جانا ہے۔ اور آپ بھی ہمارے ساتھ واپس چلیں گے۔ اتنی بڑی جاگیر کا انتظام میرے بس کا روگ نہیں ہے!"

"میں ضرور چلوں گا امبل!"

"مگر ہم اس طرح تھوڑے ہی واپس جائیں گے!"

"پھر ——!"

"بھابی بھی ہمارے ساتھ جائیں گی!"

"بھابی ——!"

"ہاں بھیا ——!" امبلا مسکرائی۔

"اب میں جیون بھر تو آپکو کنوارا رہنے دینے سے رہی!"

"مگر ——"

"شہلا ___ !" اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

"جی ___ !"

"یہ میری سب سے پہلی محبت کا وہ حقیر نذرانہ ہے جو قبول نہ ہو سکا۔"

اس نے بے حد خوبصورت کنگنوں کی ایک جوڑی شہلا کے سامنے پیش کی۔

"کیا تم میری محبت کے اس سب سے پہلے نذرانہ کو قبول کر سکو گی ؟"

شہلا نے وہ کنگن لے کر اپنی کلائیوں میں پہن لئے ___ اور جیون کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"میں نے یہ حقیر نذرانہ ناگ دیوتا کے حضور میں پیش کیا تھا تا کہ وہ اسے اپنی داسی تک پہنچا دیں۔ مگر میرا یہ کام آج سے پہلے نہ ہو سکا۔ اور آج تم نے میری محبت کے اس سب سے پہلے نذرانے کو قبول کر کے میرے دل کو بڑا سکون بخشا ہے۔ اور میں اس کے لئے تمہارا ممنون ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری محبت امر ہو گئی ہے۔ وہ مری نہیں ہے۔"

"محبت کبھی نہیں مرتی۔"

شہلا طمانیت سے بولی۔

"بشرطیکہ وہ سچی محبت ہو۔"

"سچ کہتی ہو تم شہلا!"

جیون کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔

اور چند لمحے کے سکوت کے بعد اس نے شہلا کے بائیں ہاتھ کی انگلی میں سرخ ہیرے کی ایک انگوٹھی پہنا دی۔

"اور یہ انگوٹھی میری اس محبت کی گواہ ہے جو تمہارے لئے تا مرگ میرے دل میں تابناک ہیرے کی طرح مسکراتی رہے گی"

فخر و انبساط کی ملی جلی کیفیت شہلا کی کنول جیسی آنکھوں سے باہر پھوٹ پڑی اور پھر اس خیال سے کہ کہیں اس کی یہ انمول کیفیت کو چرا نہ لے اس نے اپنی خواب آور آنکھیں آہستہ سے بند کر لیں۔

وہ اپنی اس انمول کیفیت کو اپنی پتلیوں سے بھی پرے کہیں دور چھپا لینا چاہتی تھی۔

